اسلوبیات اقبال

طارق سعید

تقسیم کار:۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس ★ علی گڑھ

باہتمام خاص : محمد اسلم حنفی

© طارق سعید

ایڈیشن : ستمبر ۱۹۷۹ء تا جون ۱۹۹۱ء
خوشنویس : مولانا محمد شبیر خاں گونڈوی

USLOOBIYAT-E-IQBAL : by :
Tariq Saeed

قیمت : سو روپے

اودھ اکادمی، اردو باغ، فیض آباد

ترتیب

دیباچہ	۵
اسلوبیات اقبال کی موضوعی، فکری اور جمالیاتی اکائیاں	۱۲
دل کی آزادی: شہنشاہی	۱۳
انسان: نوعِ انسان کا شکاری	۲۲
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے	۳۰
تفہیمِ تقدیر	۴۱
تفہیمِ خودی	۴۹
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد	۷۶
اسلوبیات اقبال کی معروضی اکائیاں	۱۰۴
اسلوبیات اقبال: میری تمام جستجو کھوئے ہوئے کی جستجو	
اسلوبیات اقبال کا تجزیاتی مطالعہ	
مسجدِ قرطبہ	۱۴۸
عشقِ تمام مصطفیٰ: عقلِ تمام بولہب!	۱۵۷

استاذی مکرّمی و مُعظمی

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی

کے نام

دیباچہ

خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ

"اسلوب محض مخصوص لفظوں کی مخصوص ترتیب نہیں، بلکہ اپنی کائنات کی پہچان، حقیقت کی تفہیم اور ایک پوری تہذیب کے ادراک یا اس سے مربوط تجربوں اور واردات کا منظر نامہ ہے۔"[1]

اقبال کی کائنات کتنی وسیع ہے، کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ ہمہ وقت یاد رہے کہ اس کائنات میں "اپنی کائنات کی پہچان، حقیقت کی تفہیم اور ایک پوری تہذیب کا ادراک" مضمر ہے۔ انہیں عناصر کے درد و داغ کی آرزو و جستجو سے اقبال کا اسلوب تشکیل پاتا ہے۔

اقبال کی مرت، اپنی کائنات کی پہچان اور حقیقت کی تفہیم کا نچوڑ کیا ہے؟ سلیم احمد لکھتے ہیں: "خودی اقبال کی شاعری کا سورۂ اخلاص ہے۔ یہ ان کی فکر کا جوہر اور پیغام کا خلاصہ ہے۔ خودی کو سمجھے بغیر آپ اقبال کو نہیں سمجھ سکتے۔"[2] یہ خودی کیا ہے؟ اپنی کائنات کی پہچان اور حقیقت کی تفہیم ہی تو ہے۔

اقبال بڑے شاعر تھے۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن وہ بڑے شاعر کیوں تھے، اس سوال کا کوئی مفصل اور قرار واقعی جواب نہیں مل سکا۔ اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو اہمیت دینے والے نقاد بھی ان کے شکوہ الفاظ، آہنگ کی بلندی اور تنوع ،

۱؎ انتظار حسین اور ان کے افسانے (مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ) شمیم حنفی ص ۶۰

۲؎ روایت ۴ بیاد سلیم احمد، لاہور، پاکستان۔

استعارہ و تشبیہہ کی چمک دمک غالب و بیدل کے ان پر اثر وغیرہ کے بارے میں سرسری باتیں کہہ کر، تان وہیں توڑ دیئے ہیں کہ اقبال بڑے مفکر تھے (اثبات و نفی از شمس الرحمٰن فاروقی)

اقبال کی اپنی کائنات کی پہچان اور حقیقت کی تفہیم میں بڑے سے بڑے ناقدین ادب نے پگ کھایا ہے، ہمہ شما کی کیا گنتی؟ انہیں ایک پورے سیاسی نظریہ کا بانی اور ملک کا معنوی خالق کہا گیا ہے وہ حکیم الامت اور ترجمان حقیقت اور شاعر مشرق کہلائے۔ وہ فلسفی، مومن، مجاہد، ولی کامل اور مرد خود آگاہ کے القاب سے ملقب ہوئے..... اہل ایران نے ان کا کلیات فارسی بڑے اہتمام سے "کلیات مولانا اقبال لاہوری" کے عنوان سے چھاپا، یہ سب ہوا، لیکن انھیں شاعر کسی نے نہ مانا..... ہمارے اردو کے "اہل زبان" بھی جو عامیانہ غزل گوئی کے بہانے شاعری میں بھان متی کا تماشا دکھاتے ہیں، "اقبال کو "اہل زبان" ماننے سے گریز کرتے رہے اور اب بھی ان کے منکر ہیں، پھر؟ اقبال کی شاعر مشرقیت اور حکیم الامتیت کسی کام کی جب شاعر (یعنی زبان کو خلاقانہ طور پر استعمال کرنے والے فنکار) کی حیثیت سے ان کا اتنا بھی مقام نہ ہو جتنا امیر اللہ تسلیم کا ہے؟ (اثبات و نفی از شمس الرحمٰن فاروقی)

گویا اپنی کائنات کی پہچان، حقیقت کی تفہیم اور زبان کا خلاقانہ استعمال ان سب کا نام ہے، اسلوب اقبال۔

فلسفیانہ مسائل کو سمجھنا یا ان کو بیان کرنے پر قادر ہونا، شاعر کے لیے ضروری نہیں۔ زندگی اور انسان اور خود اپنے اندرون کو سمجھنا اور اس کی حقیقت بیان کرنے پر قادر ہونا یقیناً ضروری ہے..... شاعر کا مرتبہ یہ ہے کہ وہ ہم کو خواب دیکھنا سکھاتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ہمارے ہاتھ میں سپاہی کی تلوار یا حجام کا استرہ یا جلوس باز کا جھنڈا رکھ دیتا ہے۔ (شمس الرحمن فاروقی) اس اعتبار سے جائزہ لیجیے۔ تو اقبال فلسفیانہ مسائل کو سمجھنے، ان کو بیان کرنے پر قادر ہونے کے علاوہ، زندگی، انسان اور خود اپنے اندرون کو سمجھنے اور اس کی حقیقت بصورت خواب دکھانے پر بھی قادر ہیں۔ اس مناسبت سے دیکھیے تو اقبال کا مرتبہ دوسرے فنکاروں کے مقابلہ میں کم از کم ایک درجہ اونچا ہونا چاہیئے۔ اور انھیں میر و غالب پر فوقیت حاصل

ہونی چاہیئے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اور شاید ان کا نمبر انیس کے بعد آتا ہے ورنہ شمس الرحمان فاروقی چکبست کے ساتھ رکھ کر ان کو یعنی اقبال کو غیر تخلیقی کیوں کہتے ہیں؟ جیسا کہ اقبال کا یہ شعر ہے

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے؟
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

بقول فاروقی صاحب، بڑی حد تک غیر تخلیقی ہے۔ اقبال کوئی پیغمبر نہ تھے، خالص طبعی و جذباتی قسم کے انسان اور وہ بھی شاعر تھے، خود فاروقی صاحب کو احساس ہے کہ جس طرح کسی پیغمبر کے لئے یہ باعثِ افتخار نہیں کہ اسے شاعر کہا جائے، اسی طرح کسی شاعر کے لئے یہ باعث افتخار نہیں کہ اسے پیغمبر کہا جائے۔" اسی اصول کو سامنے رکھ کر مذکورہ بالا شعر کو دیکھئے کہ یہ شعر ہے بھی یا صرف سوال و جواب کو میکانکی انداز سے سیٹ کر کے منطقی طور پر پیش کر دیا ہے، جیسا کہ فاروقی نے کہا ہے۔

یا کیا تخاطب کا یہ انداز شعر اقبال کی بنیادی اسلوبیاتی جہت نہیں؟ شاہد خطاب کی خواہش اقبال کی سب سے بڑی خواہش ہے، اقبال کے اسلوبیاتی مطالعے میں خطاب کی اس شدید خواہش کو کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شعر اقبال کی عام کیفیت ایک ایسے تخاطب کی ہے جس کو عمومی تخاطب کہنا مناسب ہوگا، یہ تخاطب بنی نوع انسان سے، رسالت مآب سے، اہل ہند سے، جوانان قوم سے، یا ملت اسلامیہ سے ہے۔ عمومی تخاطب کی یہ کیفیت اقبال کی پوری شاعری میں موج تہ نشین کی طرح جاری و ساری ہے۔ (ادبی تنقید اور اسلوبیات از گوپی چند نارنگ)

خالص معروضی انداز سے اقبال کے اس شعری تجربہ کو ملاحظہ کیجئے تو چند باتیں پہلی نظر میں دکھلائی پڑتی ہیں۔ مثلاً پہلا، مصرعہ میں استفہامیہ انداز، ت کی آوازوں کی تکرار، انائیتی طرز پر خطابت کی خو بو، خطاب میں مضمر اپنی جان کاری یا ستر تقدیر امم کی حقیقت سناشی ایک جانب اور سب سے بڑھ کر "میں تجھکو بتاتا ہوں" میں چھپی انائے کبیر کی گونج کہ جیسے یا تو کوئی شیر جنگل میں دہاڑ رہا ہے یا جیسے عین وقت جہاد اقبال کے آئیڈیل حسین للکار رہے ہیں "میں تجھ کو بتاتا ہوں" دوسرے، "میں

تجھ کو بتاتا ہوں" میں جاننے، سمجھنے اور اس کو پوری قوت وطاقت کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت بھی صاف واضح ہے۔ یعنی یہ امر بھی صاف ہے کہ، انسان اور اس کی زندگی کے اسرار کیا ہیں؟ میں تجھ کو بتاتا ہوں، کے داخلی بطون میں من و تو کے رشتوں پر جس طرح روشنی پڑ رہی ہے، اور دوریاں، قربتوں میں تبدیل ہو رہی ہے، ان کی تفصیلات بیان کرنے سے سارا مزہ جاتا رہے گا۔

حال وقال کی ایک زبردست محفل سجی تھی، رومی کے کلام میں پوری محفل وجد و سرور میں ڈوبی ہوئی تھی، جب یہ مصرعہ آیا کہ، گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما" تو ایک مرید نے سرگوشی میں اپنے پیر ومرشد سے پوچھا، لوگ کیوں اچھل پڑے؟"
پیر صاحب نے سرگوشی ہی میں جواب دیا اور نہ جانے کیسے ساقی آواز نے جو دست بوسی کرتے پیر صاحب تک آگیا تھا، ان کے الفاظ سن لیے اور پھر کیا تھا؟
ساز کی رگوں میں یہ الفاظ خون کی طرح دوڑ رہے تھے، "میں تجھ کو بتاتا ہوں" محفل بے ہوش ہوئی جاتی ہے اور وہ جام کے جام انڈیلے جارہا تھا۔ شاید ساقی آواز و آہنگ نے سرگوشی میں کہی گئی کل بات کو سن لیا تھا، لیکن وہ خود اتنا بدہوش ہوگیا تھا کہ صرف "میں تجھ کو بتاتا ہوں" کی مکرر آواز و آہنگ پر داد و تحسین کے خزانہ لٹا رہا تھا۔
"میں تجھ کو بتاتا ہوں" کہ یہ کیفی تخلیقیت جس میں میر کی میریت اور انیس کی لہجیت اور آج کے افتخار عارف کے غم کی پرچھائیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اب صرف اشارے ہیں: پہلے مصرعہ کے دوسرے حصہ میں "م" کی وجہ نغمیت صاف ہے، "م" پر زور اور کیا پر بل اور طویل آہنگ کے اثرات نمایاں ہیں۔ دوسرے مصرعہ کے دونوں حصے میں ایک نوع کی آواز ہی نکل آرہی ہے۔ گویا فوج کے نقارہ کی چوٹ یکساں زور اور لہر سے نکل رہی ہے۔
خطابت اپنے کمال پر ہے اور لگتا ہے کہ کوئی بادشاہ نزول اجلال فرمانے والا ہی ہے۔ ایسی کیفیت کو جس سے فن کار کی اپنی کائنات کی تفہیم پوری خلاقانہ شان سے ظہور پذیر ہوسکے اسلوب کہتے ہیں! اقبال کا اسلوب اپنی کائنات کے اظہار میں "اسلوب جلیل" ہے۔
جس کی وضاحت اگلے سطور میں کرنے کی کوشش کی گئی (نوٹ اسلوب اقبال کے مطالعہ میں اسلوبیاتی تصورات کی روشنی میں اس شعر کو رکھ کر دیکھیے۔)

یہ واقعہ ۱۹۷۸ء کا ہے کہ میں ایم۔اے کر کے ریسرچ میں داخلہ کے لئے تیاری کر رہا تھا ایم۔اے کے درسی مطالعوں کے تحت، اقبال میرے خصوصی مطالعے کے باعث بنے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد، شعبہ فارسی، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی نگرانی میں مطالعہ اقبال شروع ہوا میں اور طالبہ زینت کوہ بہت ہی عرق ریزی سے پڑھاتے تھے۔ پھر مجھے یوسف سلیم چشتی کی "شرح" ملی۔ اس شرح اور ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں خودی پر میں نے ایک سیشنل مضمون لکھا۔ لیکن بات بنی نہیں؛ بہت سنوارا، بنایا، لیکن دغدغہ لگا رہا، آخر کار مئی ۱۹۷۹ء میں ماہنامہ فاران کراچی میں "تقدیر" پر میرا مضمون شائع ہوا، اور قلم چل نکلا؛ اور اقبال سے میری محبت حد سے بڑھنے لگی جس کا ثبوت، اسلوبیات اقبال کی صورت میں پیش ہے۔

دسمبر ۱۹۷۹ء کو آر ایس کے ڈی ڈگری کالج کی ملازمت کے لیے جب مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا، تو یہ کتاب، "اقبال، فن، و فلسفہ" کے نام سے مختلف مضامین کی صورت میں پیش کی گئی۔ جس کا زیادہ تر حصہ موضوعی مباحثوں پر مبنی تھا۔ لیکن میرا تحقیقی کام اور اصل میدان اسلوبیات سے متعلق ہونے کے سبب، کتاب خود بخود اسلوبیات اقبال کی شکل اختیار کر گئی؛ جس کا احساس مجھے تب ہوا جب یہ کتاب مہربان کاتب مولانا محمد شبیر خاں کی گاڑھی مشقتوں سے حرف شیریں کے ساتھ حرف حسین کی بھی مصداق بن گئی۔ میں ان کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔

علم اسلوبیات میں انسان، زندگی، زمانہ، تقدیر، اقدار، اقتدار، جنگ، جدل، فردیت، اجتماعیت وغیرہم کا مطالعہ، اقبالیات کے تناظر میں ضروری ہے۔ کیوں کہ اسلوبیات کے مطالعہ میں صرف لسانی، نحوی، صرفی اور ساختیاتی اکائیوں کا مطالعہ مقصود نہیں ہوتا۔ موضوعی اکائیوں سے بھی سروکار رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ فنکار کی فکری، نفسیاتی، وجدانی اور ادراک کی سطحوں کی دریافت بھی ضروری ہوتی ہے اور اگر انھیں قابل مطالعہ نہ تصور کیجئے تو جمالیاتی اکائیوں کا سرے سے ہی خون ہو جائے گا۔ جو اسلوبیات کے بعض ماہرین مثلاً لوکس۔ مرے اور لانجائنس وغیرہ کو منظور نہیں۔ (ملاحظہ کیجئے خاکسار کی کتاب؛ اسلوب؛ اصول و نظریات)

پھر فارم، ہیئت اور لسانیات کی باری آتی ہے، تو خاکسار کا مضمون بہت پہلے بھی شاعر میں آچکا ہے، جس کی دوسری اشاعت پاکستان ۱۹۸۵ء میں ظہور میں آئی، اس کی ہی توسیع "میری تمام جستجو" کا مرکز و محور ہے۔

ایک بات اور، اگر آپ کسی خاص موضوعی اکائی مثلاً "جہاد" کو اقبال کی اکائی تسلیم نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں لیکن کم از کم اسے خاکسار کی فکری اکائی مان لیں اور یہ بھی ماننا چاہیں تو نہ مانیں لیکن مانگے کا دیا تو مان ہی لیں کیونکہ خاکسار کی تاریک دنیا انھیں چراغوں سے روشن ہے۔ یہ چراغ بھلے اقبالیات کی تفہیم کے لئے ضروری نہ ہوں لیکن انسان، زندگی اور زمانہ کی کش مکشوں کی تاریک راہوں سے صحیح و سلامت گزرنے کے لئے ضروری اور بہت ضروری ہیں۔ یہ چراغ وہ ہے جسے ساتھ لئے رومی و غزالی گرد شہر گشت لگا رہے ہیں، انسان کی تلاش میں۔

بعض اقبال پرستوں نے اس چراغ کو اقبال کی اصل کائنات ثابت کر دیا ہے، لہٰذا اقبال پرستوں سے معذرت کے ساتھ عرض ہیکہ خالص معروضی، اور عقلی بنیادوں پر آخر میں دو تجزیے بھی شامل کتاب ہیں، جس سے اقبال کے چراغ کی قلعی کھلتی ہے!

اور اسلوبیات کی نئی بحثوں کے دروازے وا ہوتے ہیں۔ ان تجزیوں سے اگر کسی بھی شخص یا اشخاص کو فکری یا جمالیاتی صدمہ پہنچے تو معافی کا خواستگار ہوں۔

اس موقع پر پروفیسر سید مشاہد الحسن لو نہروی کا خصوصیت سے شکریہ ادا کرنا اپنا فرض منصبی تصور کرتا ہوں، جن کی بیش قیمت رہنمائی، تلقین اور حوصلہ افزائیوں کے نتیجے میں یہ کتاب اشاعت کی منزل سے ہمکنار ہوئی، نیز اپنی شدید عدیم الفرصتی اور مسلسل علالت کے باوجود معظمی استاذ محترم نے نہایت محبت و شفقت سے مسودہ دیکھ کر، کتاب کے بارے میں اپنے گرانقدر الفاظ عطا کئے اور کتاب کو درجہ استناد کا رتبہ بخشا میں ان کا عمر بھر ممنون رہوں گا۔

میں اپنے شاگرد عزیز، مجبی محمد اسلم حنفی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے پروف ریڈنگ کے جملہ نوع کے بار گراں کو بے حد ہنسی خوشی برداشت کیا۔ کہ یہ

صعوبت اگر وہ نہ اٹھاتے تو شاید کتاب آپ کے ہاتھوں میں اس تیزی کے ساتھ نہ پہنچ پاتی۔

اس موقع پر میں اپنے رب کی حمد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جس نے مجھے توفیق بخشی، موقع میسر کیا اور حالات پیدا کئے کہ میں کتاب پیش کر سکوں اس کی حمد و ثنا سے میرا قلب و جگر اور دماغ سجدہ ریز ہے۔

والدین کی دعائیں میرے لیئے سایۂ عاطفت ہیں اور شریک حیات کی نگاہیں سایۂ الفت کہ یہ لوازمات اگر شامل حال نہ ہوں تو اچھا خاصا قلم کار بے قلم ہو جائے۔ میرا خلیہ خلیہ ان کی درازئ عمر کی دعا کر رہا ہے۔

طارق سعید

یکم جنوری ۱۹۹۱ء
ساکیت کالج، اودھ یونیورسٹی، فیض آباد

اسلوبیات اقبال

کے

موضوعی، فکری اور جمالیاتی اکائیاں

دل کی آزادی : شہنشاہی

دورِ حاضر میں امن و آزادی کا نعرہ بہت پرکشش ہو گیا ہے۔ اب کسی معقول اور متوازن مزاج کو اس نعرے سے اختلاف کرنا ناممکن سا ہو گیا ہے مگر بہت کم اذہان میں امن اور آزادی کا صحیح تصور پایا جاتا ہے۔ امن کسے کہتے ہیں ؟ آزادی کا صحیح تصور کیا ہے ؟ دونوں میں باہمی ربط کیا ہے ؟ یہ نعرہ اتنا پرکشش کیوں ہے ؟ یہ کیا، کیوں اور کیسے، ہمارے لئے نہایت اہمیت کے حامل ہیں اس لئے ان پر غور و فکر کرنا نہایت ضروری اور مفید ہے تاکہ امن و آزادی جو روٹی کپڑا اور مکان پر بھی مقدم ہے۔ اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ انسانی زندگی میں اپنا جائز اور مناسب مقام حاصل کر سکے۔

اصولی طور پر ہمیں ایسا امن مطلوب ہے جس میں آزادی ہو اور ایسی آزادی درکار ہے جو امن کی ضامن ہو۔ یہ دونوں چیزیں فرد کی ارتقا، سماج کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل کے لئے بنیادی ضرورتیں ہیں۔ اسی لئے ہم اس آزادی کو اپنا موضوع گفتگو بناتے ہیں جس میں امن اسی طرح موجود ہو جس طرح مجاز میں حقیقت یا الفاظ میں معنے مضمر ہوتے ہیں۔

اسلام عام حریت کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ نوعِ انسانی کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرنے کے لئے آیا ہے۔ وہ آزادی کا ایک جامع و مکمل پروگرام رکھتا ہے اس کی نظر میں حقیقی آزادی دل کی آزادی کے بغیر ناممکن ہے کیوں کہ آزادی دراصل دل کی آزادی کا نام ہے۔ دل کی آزادی شہنشاہی ہے۔ یقیناً دل کی آزادی میں شہنشاہی کی لذت ہے۔ دل کی غلامی بدترین قسم کی غلامی ہے۔ اسلام

اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام ہی وہ تنہا نظام زندگی ہے جو اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ وہ دل کو ہر نوع غلامی سے آزاد رکھنے کیلئے تمام مثبت و منفی ذرائع کو اختیار کرتا ہے اور ہر اس اصل دروازے اور چور دروازے کو بند کر دیتا ہے جس سے دل کی آزادی پر حملہ ہو سکتا ہے۔

اسلام آزادی ہی نہیں، دل کی آزادی کا نام ہے۔ اس کا بنیادی عقیدہ، اس کا انقلابی نعرہ، اس کا نصب العین اس کا موضوع اور اس موضوع کا مرکزی نقطہ غرض سب سب کچھ دل کی آزادی ہے۔ خدا کا کلام، خدا کے رسول کی زبان اور عمل اسلام ہے۔ خدا گواہ ہے ان دونوں کا موضوع اپنی تمام کمال تفصیلات میں انسان کی آزادی دل کے محور پر گھومتا ہے۔ انسان اپنے خدا کے ہنر کا شاہکارِ تخلیق ہے اور خدا کے اس زمین پر بلکہ اس کی پوری سلطنت میں اس کا خلیفہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور فی الواقع وہ اس کا خلیفہ ہے۔ وہ اپنے مقاصد میں قدسیوں سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ محفلِ قدرت میں مثال شمع روشن ہے۔ اس کی وسعتِ فطرت میں آسمان ایک نقطہ ہے اس کا ناخن ساز ہستی کے لئے مضراب ہے۔ اس کی ہستی پے گلزار وجود باغباں ہے۔ وہ حسن کی انجمن اور عشق کا صحیفہ ہے جس کی تصویر و تفسیر یہ بزم دنیا ہے اگرچہ اس کی نمود خاک سے ہے مگر اس کی سرشت کوکبی و مہتابی ہے۔ یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں، یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں، اس کی تصرف میں ہیں۔ زمانہ اس کی آنکھوں کے اشارے سمجھتا ہے۔ اس کے بحرِ تخیل کے کنارے ناپید ہیں۔ اس کی آنکھوں کے شراروں کی فلک تک رسائی ہے۔ اس کی ضو میں خورشید جہاں تاب کی ضو ہے اس کے ہنر میں ایک تازہ جہان آباد ہے۔ وہ اگر لذت بیداری سے واقف ہو تو اس کی خاک پر اسرار ثریا سے بھی اونچی ہے۔ اس کی آغوش میں وہ تجلی ہے جس میں افلاک اور سب ثابت و سیارے کھو جائیں۔ اس کی دانش و بینش سے اس عالم کی کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی۔

دانائے ناکامی! ان خوبیوں اور بلندیوں کا مالک، خدا کا خلیفہ و نائب

اپنی متاعِ کارواں گم کئے بیٹھا ہے اور اس کے کارواں کے دل کو اس زیاں کا احساس تک نہیں ہے۔ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے والا ابھی تک اپنی شب تاریک کو سحر نہ کر سکا۔ ستاروں کی گذرگاہوں کا ڈھونڈھنے والا اپنے افکار کی دنیا میں بھٹک رہا ہے۔ وہ حکمت کے خم و پیچ میں ایسا الجھا ہوا ہے کہ ابھی تک اپنے نفع و ضرر کا فیصلہ نہیں کر سکا ہے۔

خالق و مالک کائنات، بادشاہ کل اپنی اس شاہکار تخلیق کو اپنی بے مثال سلطنت میں یہ شاندار بلند ترین منصب عطا کر کے اس سے اس کے شایانِ شان توقع رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا خلیفہ اس کی سلطنت میں اس کے حکم کے مطابق حکومت کرے۔ میری دنیا میں تیری بادشاہی کا وہ عملی نمونہ ہو، مگر خدا کی نیابت کیلئے شرط اول دل کی آزادی ہے۔ خدا کے نائب کے دل میں غیر خدا کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اللہ عزّ و جل عالم الغیب ہے۔ ماضی حال مستقبل اس پر روشن ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دل کی آزادی کے بغیر اس کی نیابت کے فرائض انجام دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ وہ اسے واضح مثبت انداز میں آزادی دل یعنی تنہا اپنی عبادت، اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیتا ہے۔ نیز واضح منفی انداز میں ماسوا اللہ کی عبادت، اطاعت و فرمانبرداری سے روک دیتا ہے۔ اسلام کا بنیادی عقیدہ ــــ عقیدۂ توحید ــــ لا الٰہ الا اللہ۔ اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔

لا الٰہ الا اللہ انسان کی آزادی، انسان کے دل کی آزادی کا نام ہے۔ اور نظام اسلام کے بنیاد کی خشت اوّل اور اس گلشن کی بہار ہے اس کلمہ کے مطابق سروری فقط ذات بے ہمتا کے لئے ہے اور دل و دنیا پر حکمراں بس وہی ہے باقی سب حکمراں بتانِ آذری ہیں۔ آزادی دل توحید کا تقاضا، زمانے میں خدا کا آخری جاوداں پیغام، ناموس ہستی، ندائے آفاق، اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت جادہ پیمائی تسلیم و رضا، اللہ کا سودا اور مومن کی اذان ہے۔ دل کی آزادی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنا اور زندگی کی پوری اکائی میں ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرنا تاکہ کماحقہ،

خلافت کے فرائض کی انجام دہی ہوتی رہے، اسلام ہے۔ جو شخص اس شرط کو پورا کرنے کے لئے آگے بڑھے جس کو وہ جان جان عزیز تر از جان ہو، مومن ہے۔ مومن آزادی میں یگانہ و یکتا، قسمت عالم کا کوکب تابندہ اور خدائے لم یزل کا دست قدرت اور زبان ہے اس کا کام ابراہیم کا ایمان رکھنا، ہر بت کو بالا کرنا، آزادی دل کے نغمۂ رنگیں کو ہر گوش پر عریاں کرنا، نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑانا، صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانا اور گلستاں کو خس و خاشاک سے خالی کرنا ہے ؎

لب کشا ہو جا سرود بربط عالم ہے تو

اس آزادی دل پر یقین نہ رکھنے والا کافر ہے اور غلامی دل پر راضی رہنے والا مشرک ہے۔ دل مومن آزاد ہوتا ہے، ماسوا اللہ سے آزاد ہوتا ہے۔ یعنی صرف اس خدائے واحد کا غلام ہوتا ہے جس کا وہ نائب ہے۔ دل کافر غلام ہوتا ہے ماسوا اللہ کا غلام ہوتا ہے خدا کی غلامی اور اس کی نیابت و خلافت کے نور سے محروم ہوتا ہے۔

نہ تخمِ لا الٰہ تیری زمین شور سے پھوٹا

دلِ مشرک خدا کے ساتھ ساتھ بہت سے بتانِ آذری کا بھی غلام ہوتا ہے۔ اس کے دل پر کافروں کی طرح نہ جانے کتنے لات و منات کا قبضہ و تسلط ہوتا ہے۔ کافروں کی طرح اس کے سینے میں ہوس کی نہ جانے کتنی تصویریں ہوتی ہیں۔

چوں کہ آزادی، دل کی آزادی کے بغیر ناقص اور انسانیت کی توہین ہے اس لئے ابلیس جو روز اوّل سے اس کا بدترین دشمن ہے۔ چاہتا ہے کہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے والے کی شب تاریک کبھی سحر نہ ہو۔ ستاروں کی گذرگاہوں کو ڈھونڈھنے والا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر کے کبھی منزل مقصود پر نہ پہونچے۔ اپنی حکمت کے خم و پیچ میں وہ ایسا الجھا رہے کہ اپنے نفع و ضرر کا کبھی فیصلہ نہ کر سکے۔ چنانچہ اس کی روشن رات کو تاریک رکھنے کے لئے اس عالم کردار سے بیگانہ رکھنے کے لئے تا قیامت اس کے دل کو غلامی میں رکھنے کے لئے اس کے آزادیِ دل پر کھلے اور چھپے تمام راستوں سے حملہ آور ہو کر اس کے آزاد دل پر اپنا قبضہ و تسلط جمانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ازل سے

تاامروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی ستیزہ کار رہا ہے اور تا قیامت رہے گا۔ اس ستیزہ کاری میں بولہبی کو جب بھی کامیابی حاصل ہو جاتی ہے وہ اس سے وہ کچھ کراتا ہے جس سے انسانیت شرمندہ ہے۔ وہ اس کے دل میں بتوں کا عشق جماتا ہے۔ اس کے دل کو مرعوب سلطان وامیر، عقل کا غلام بناتا ہے۔ اس کے دل کو مردہ وافسردہ وناامید بیگانہ اخلاص ومروت بناتا ہے۔ اگرچہ منطق کی دلیلوں میں اسے چالاک کرتا ہے۔ بندوں کا گدا بناتا ہے۔ بتوں سے امیدیں بندھاتا ہے، خدا سے ناامید کرتا ہے۔ اسے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری گرفتار حاضر وموجود کرتا ہے۔ دربار سلطانی وامیر میں اور زنجیر طلائی کا اسیر کرتا ہے۔

غلام دل کے تازہ خداؤں میں وطن سب سے بڑا ہوتا ہے۔ عصر رفتہ کے انھیں ٹوٹے ہوئے لات ومنات پر جان دیتا ہے۔ بت پندار کو اپنا خدا بناتا ہے وہ صاحب ہوش اس شام وسحر میں کھو جاتا ہے۔ قصہ پیمان اوّلیں بھلا دیتا ہے بتوں کو حرم نشین بناتا ہے۔ اپنوں کو صلیب پر لٹکا دیتا ہے۔ اسیر حلقۂ دام ہوا ہوتا ہے۔ عارضی لذت کا شیدائی ہوتا ہے۔ اپنے دل کے آئینے میں اسے اپنی ادا نظر نہیں آتی اس لئے وہ اپنا دل حسینوں کی اداؤں پر فدا کرتا رہتا ہے۔ حسنِ ظاہری پر مرتا ہے۔ ہر روز مرتا جیتا ہے۔ بیداد اجل اس کی آرزو کو خون رلواتی ہے۔ روشن ضمیری اس سے رخصت ہو جاتی ہے۔ محکومی وتقلید سے اس کی آنکھ کور ہو جاتی ہے حقائق اسے بے پردہ نظر نہیں آتے۔ اس کا دین سرمایہ داری اور سرمایہ فقط دیدۂ نمناک ہوتا ہے۔ اس کی سیاست لادیں چنگیزی ہوتی ہے۔ اس کا دل تیرہ، دماغ روشن ونگاہ بے باک ہوتی ہے اس کی روح میں پاکیزگی نہ ہونے کی وجہ سے ضمیر پاک خیال بلند وذوق لطیف ناپید ہوتا ہے۔ فکر بے نور، جذب عمل بے بنیاد ہونے کی وجہ سے وہ زمین پر خوار وزار وزبوں ہوتا ہے۔ وہ آفاق میں گم ہوتا ہے۔ دل کی غلامی میں افراد اور قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔ خوب، ناخوب ہو جاتا ہے۔ زندگی گھٹ کے ایک جوئے کم آب رہ جاتی ہے۔ دل سوز سے خالی

اور نگہ ناپاک ہوتی ہے اس لئے وہ بے باک نہیں ہوتا۔ وہ ہلاک جادوئے سامری وقتیل شیوہ آذری ہوتا ہے۔ قفس کو آشیاں سمجھتا ہے۔ سراب رنگ وبو کو گلستاں سمجھتا ہے۔

آزادی دل عشق خدا سے آباد ہوتا ہے۔ طواف بتان سے آزاد ہوتا ہے بیم دریا سے پاک قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہوتا ہے۔ ہزار خوف ہو زبان اس کی رفیق ہوتی ہے۔ زندہ و پُرسوز و طربناک ہوتا ہے۔ مرعوب سلطان و امیر نہیں ہوتا۔ عقل کا غلام نہیں ہوتا۔ کشتی و ملاح کا محتاج نہیں ہوتا۔ دل کی آزادی میں زندگی بحرِ بیکراں ہو جاتی ہے۔ دل کی آزادی میں اس رزق پر موت کو ترجیح ہوتی ہے جس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو۔ دل کی آزادی دل روشن نفس گرم ہوتا ہے اپنے رازق کی پہچان ہوتی ہے اس لئے دارا و جم اس کے گدا ہوتے ہیں۔ دل کی آزادی مومن کا دین اور اس کا گنج گراں مایہ ہوتی ہے۔ اس کا کاشانہ دل خدا کی منزل ہوتا ہے۔ اس کی خاک میں دل زندہ و بیدار و آزاد ہوتا ہے اس لئے سینہ آدم میں وہ عرش معلّٰے سے کم نہیں ہوتا۔ لذت آشنائی عجیب چیز ہے۔ آزاد دل کو دو عالم سے بے گانہ کر دیتی ہے۔

دل کی آزادی کے لئے یقین شرط اوّل ہے۔ جب اس انگارۂ خاکی میں یقین پیدا ہوتا ہے تو وہ بال و پر روح الامین پیدا کر لیتا ہے۔ یقین سے وہ درویشی ہاتھ آتی ہے جس کے سامنے فغفوری جھکتی ہے۔ یقین کی متاع گراں بہا جس کو مل جاتی ہے اسے سیم و زر سے محبت ہوتی ہے نہ افلاس کا غم ہوتا ہے۔ اس جہان میں انسان اگرچہ زندانی اسباب ہے مگر مومن قلب کو اس سے آزاد رکھتا ہے۔

آزاد دل مردان خدا کا آستانہ دربار شہنشی سے خوش تر ہوتا ہے۔ آفاق اس میں گم ہوتا ہے۔

صاحب دل کی نگاہ میں سلطنت روم و شام درے ناچیز ہوتی ہے۔ اس کا سینہ اس کے پیام ناز کا جو دہر میں پیدا کبھی اور پنہاں کبھی ہے امین ہوتا ہے۔

اس خاکی ونوری نہاد بندہ مولی صفات کا دل بے نیاز دو جہاں سے غنی ہوتا ہے ۔ وہ خاکی ہوتا ہے مگر خاک سے پیوند نہیں رکھتا۔ وہ بندۂ خدا ہوتا ہے مگر اس کی بندگی خدائی ہوتی ہے۔ جس کا دستور خدا اور اس کے رسول کا کلام ہوتا ہے اس لئے اس کے دور خلافت میں چمن کا روان بہار خیمہ زن ہوتا ہے۔ زمین رشک ارم بن جاتی ہے۔ نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی جھومتی ہے۔

قید میں آکر دل کو آزادی حاصل ہوتی ہے۔ دل کی آزادی میں دل زندہ ہوتا ہے۔ نگاہ عشق کو دل زندہ کی تلاش ہوتی ہے۔ عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے برق گرنے سے نخل دل ہرا۔ دل کے لٹ جانے سے اس کا گھر آباد ہو جاتا ہے۔ لٹا دل لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہے۔ اس کے لئے عشق بے حفا اور محبت بے ستم بے مزہ ہوتی ہے ؎ قصۂ دار و رسن بازی طفلانۂ دل۔ زیر خنجر بھی دل آزادی کا پیغام سناتا ہے اس کی چشم و خرد میں تجلی کا نور ہوتا ہے۔

جب سے آباد ہوا عشق مرے سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

اے نوجوان مسلم! کبھی ٹھنڈے دل سے تدبر کر کہ تو جس گردوں کا ایک ٹوٹا ہوا تارہ ہے وہ گردوں کیا تھا! جب دل کو آزادی تھی تو کیا شہنشاہی تھی! وہ قوم جس نے تجھے اپنی آغوش محبت میں پالا ہے۔ نشہ مئے آزادی دل سے سرشار تھی۔ وہ خود آگاہ و خدا مست تھی۔ اس نے تاج سر دارا پاؤں میں میں کچل ڈالا تھا۔ وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ تمدن آفریں، خلاقِ آئین جہاں داری تھا۔ اس کی شان امارت میں الفقر فخری کا سماں چھایا ہوا تھا۔ گدائی میں بھی وہ اللہ والے اتنے غیور تھے کہ منعم کو ان کے در سے بخشش کا یارانہ تھا میں تجھ سے کیا کہوں کہ وہ صحرانشیں کیا تو گفتار وہ کردار تھے، تو ثابت، وہ سیارہ تھے۔ وہ دہر میں غارت گر باطل پرستی، شاہد آزادیِ دل تھے۔ ان کے چلے جانے سے انسان رسوا ہو گیا ہے۔ تو نے اسلام کی ان اللہ والوں

سے، جو میراث پائی تھی، گنوا دی۔

جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں

نہ تیرے وہ حوصلے ہیں، نہ توان جیسا ہے۔ نہ تیرا دل ان کی طرح ہے۔ تیرا گھر اجڑ گیا کیوں کہ عشق جو رونق محفل تھا۔ تجھ سے روٹھ گیا۔ تو زبان سے لا الٰہ کی رٹ لگا رہا ہے۔ مگر تیرا دل و نظر مسلماں نہیں ہے تو رقابت، خود فراموشی، ناشکیبائی ہوسناکی کا شکار ہے۔ تیرا وہ شعلہ روشن جس سے غلامی کی ظلمت گریزاں تھی گھٹ کے مثل شرر تارے سے بھی کم نور ہو گیا ہے۔ اس لئے آسماں نے تجھے اوج ثریا سے قعر ذلت میں پھینک دیا تو کیا شکوہ؟

اے دلکی آزادی کا امین! تیری تربیت آغوش بیت اللہ میں ہوئی ہے لیکن تیرا دل شوریدہ صنم خانے کا سودائی ہے۔ تیرا شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش ہے۔ مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید تیرے اسلام کا تحفہ ہے۔ تجھ میں کلیم کا سلیقہ ہے نہ خلیل کا قرینہ ہے۔ اے قیس! تیرا سوز درد دوں کیوں کر ٹھنڈا ہو گیا؟ اسلام تیرا دیس ہے اور اس دیس میں تیرا دل آزاد ہونا چاہئے۔ تیرے دل کی غلامی پر کفر خندہ زن ہے۔ تیرے کاشانۂ دل میں باطل کے مکین ہونے پر بت صنم خانوں میں خوش ہیں۔ اپنے دلِ مردہ کو دوبارہ زندہ کر! اسے لذت آزادی سے آشنا کر!

اے مسلمان! آزادی دل کے گراں مایہ سرمایہ کو تو گنوا رہا ہے۔ کعبہ تیرے پہلو میں ہے اور تو سودائی بت خانہ ہو رہا ہے۔ تیری دانش افرنگی تیرا ایمان زناری ہے ہے تو صنم کدۂ کائنات میں کھویا جا رہا ہے۔ تیری زندگی کہہ رہی ہے کہ تو مسلم نہیں ہے۔ تیرا در یا لذت طوفان سے نہ آشنا ہے۔ تو نے اپنے دل کو رفعت کی لذت سے آشنا نہیں کیا اور مثال نقش پا اپنی زندگی کو پستی میں گذار رہا ہے۔ آج تیرا سینہ کیوں شرر آباد نہیں ہے؟ غافل اپنی

حقیقت سے آگاہ ہو تو قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے۔ تیری نسبت براہیمی ہے تو معمار جہاں ہے۔ مغلوب گماں مت ہو۔ یقین پیدا کر۔ آزادی دل پر یقین سے آج بھی آگ انداز گلستاں پیدا کر سکتی ہے۔ آج بھی شعلہ بن کر خاشاک غیر اللہ کو پھونکا جا سکتا ہے۔ تیری عقابی روح آج بھی بیدار ہو سکتی ہے اور اسے آج بھی آسمانوں میں اپنی منزل نظر آ سکتی ہے۔

اے لا الٰہ کے وارث! اٹھ خواب غفلت سے بیدار ہو۔ اپنے کو پہچان ابھی محفل ہستی کو تیری ضرورت ہے۔ نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے۔ پھر نئے عہد وفا سے دل کو زندہ کر۔ دل کو پھر اسی بادۂ دیرینہ کا پیاسا بنا۔ پھر رگ باطل کے لئے نشتر ہو۔ دلوں کو آزاد زنجیر توہم کر۔ جس جہاں کا ابلیسی سیادت پر مدار ہے۔ جہاں عوام خوئے غلامی میں پختہ تر ہیں وہ جہاں زیر و زبر ہونے کیلئے اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے۔

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اپنی تلوار میں بجلیوں کے آشیانے بنا۔ تیری آزادی دل کے تیری محبت کی سیل رواں پر باندھ باندھنے کی کس فرعون میں تاب ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز! بہت مدت کے بعد پھر تیرے رندوں کو ہوش آ رہا ہے۔ دیکھ! کوئی موسیٰ پھر طلسم سامری پر چوٹ لگا رہا ہے ابلیس کے یم بہ یم، دریا، بہ دریا۔ جو بہ جو طوفان سمٹتے جا رہے ہیں۔ زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہو رہی ہے۔ کسریٰ کا تخت خالی پڑا ہے۔ طہران عالم مشرق کا جنیوا بننے جا رہا ہے۔ افغان اپنی خودی پہچان رہا ہے۔

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں!
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

انساں : نوعِ انساں کا شکاری

شوہر اور بیوی، باپ اور بیٹے، بیٹے اور باپ میں کس قدر قربت کا رشتہ پایا جاتا ہے عموماً ایک کی بات دوسرا مانتا ہے، ایک پر دوسرا اعتماد کرتا ہے ایک کی خوشی و غم میں دوسرا شریک ہوتا ہے۔ ایسا کم ہی دیکھتے ہیں آتا ہے کہ بیوی شوہر پر نثار نہ ہو، بیٹا باپ پر اعتماد نہ کرے باپ بیٹے کی جائز خواہش کو رد کرے۔ مگر اسلام کے معاملے میں کچھ دوسرا ہی منظر سامنے آتا ہے۔ نوح کا بیٹا اپنے باپ کا مخالف ہے، لوط کی بیوی اپنے شوہر کی انکاری ہے۔ ابراہیم کا باپ اپنے بیٹے کی بات پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ غور طلب بات ہے کہ ایسا کیوں ہے۔

نوح ساڑھے نو سو سال تک شب و روز ایک کر دیتے ہیں۔ قوم کے سامنے دنیا کی سب سے بڑی سچائی پیش کرتے ہیں مگر قوم برابر ان کی مخالفت کئے جا رہی ہے اگر ان کا پروگرام قوم کے لئے۔ ان کے گھر والوں کے لئے صحت بخش تھا تو قوم نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا؟ ان کی اپنی بیوی ان کے مخالف کیمپ میں کیوں چلی گئی؟ یہاں تو باپ کو بیٹے پر قربان ہوتے دیکھا گیا ہے۔ بیوی کو شوہر پر مرتے ہوئے پایا گیا ہے مگر ابراہیم کا باپ اپنے بیٹے کی جان کے درپے کیوں ہے؟ دنیا سچی اور اچھی بات کرنے والوں کا استقبال کرتی ہے۔ نیکی کی شمع پر پروانہ وار نثار ہوتی ہے مگر مکہ کے محمدؐ پر ظلم کے پہاڑ کیوں توڑے جا رہے ہیں؟ انھیں اور انکے ساتھیوں کو جلاوطن کیوں کیا جا رہا ہے؟ کہیں کوئی اپنے محسنوں کو ستاتا ہے اپنے بہی خواہوں پر ظلم ڈھاتا ہے، اپنے جگر پاروں کو قتل کرنے کی سازشیں کرتا ہے

یہ ظلم و ستم کیوں ؟ یہ احسان فراموشی کیوں ؟ یہ طوطا چشمی کیوں ؟

نمرود کی دشمنی سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی خدائی کا تخت ہل رہا تھا۔ فرعون کی مخالفت صحیح کہ اس کا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ خطرہ میں تھا۔ ابوجہل جان کا دشمن تھا کیونکہ اس کی سرداری جارہی تھی مگر مکے کے عوام کی سنگدلی کی کیا وجہ تھی ؟

پھر تاریخ میں یہ منظر بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جب اقتدار اسلام کے ہاتھوں میں آجاتا ہے تو وہی مخالفین جو کل تک اسلام کی راہ میں سنگ گراں بنے ہوئے تھے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے، اس کی پرچم تلے آآکر جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں جس مکے نے رسول اللہ کی ان کے وطن میں زندگی دوبھر کردی تھی اور جلاوطن ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا وہی ان کے اسلام میں فوج در فوج داخل ہو رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ تاریخ ہمارے سامنے یہ منظر بھی پیش کرتی ہے کہ اسلام عرب و عجم کا دین بنتا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان سلطنتیں اسلام کے لئے جگہ کرتی چلی جارہی ہیں اور وہی دین جو کل تک معتوب خاص و عام تھا آج ہر کس و ناکس کے لئے ہر دلعزیز بنتا جارہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی رویہ میں یہ زبردست تبدیلی کہاں سے آگئی ؟ کیوں کر آگئی ؟ فطرت انسانی کیسے بدل گئی ؟

کوئی مانے یا نہ مانے اسلام اس کائنات کی سب بڑی نعمت ہے بنی نوع انسان کی آزادی کا سب سے بڑا پروگرام ہے ہر نوعِ غلامی کے لیئے کھلا ہوا موت کا پیغام ہے ؎

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیئے
نے کوئی مغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشین

اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کو انسانوں کی عبادت سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت میں داخل کیا جائے۔ بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے بزرگ و برتر کی بندگی میں لایا جائے۔ غیر خدا کی چوکھٹوں پر جھکے ہوئے سروں کو اٹھا کر خدا کے سامنے سرنگوں کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ بنی نوع انسان کیلئے

اس سے زیادہ آزادی حاصل کرنا خیال است و محال است و جنوں کیوں کہ اس سے زیادہ آزادی کا مطلب بتانِ آزری کی غلامی ہے جو کھلی ہوئی گمرہی بھی ہے بندہ بندۂ بندہ ہوگا یا بندۂ خدا، اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں کسی انسان کی عملی زندگی میں کوئی ایسی حالت پائی نہیں جا سکتی جس میں بندہ بندۂ بندہ ہو نہ بندۂ خدا مگر انسانیت کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ آزادی کے سب سے اعلیٰ و ارفع و اکمل تصور کو چھوڑ کر ایک نہایت گھٹیا۔ پست اور ذلت آمیز تصور اپناتی رہتی ہے تو اسلام تو بنی نوع انسان کو زمین کی پستیوں سے نکال کر آسمان کی رفعتوں پر لے جانا چاہتا ہے اسے قعرِ مذلت سے نکال کر عز و شرف کا تاج پہنانا چاہتا ہے مگر وہ سب کچھ ٹھکرا کر ذلت و نکبت میں زندگی گذارنا پسند کرتا ہے۔ لہٰذا ہم پھر اپنے اسی پرانے سوال کی طرف پلٹتے ہیں ؎

کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انساں کی رات ؟

یا بہ الفاظ دیگر ؎

جہاں کی روحِ رواں لا الٰہ الا اللہ

مسیحؑ و میخ و چلیپا، یہ ماجرا کیا ہے؟

اس زمین کے کسی حصہ میں، ماضی، حال، مستقبل، کسی دور میں دو قسم کے نظام ہائے زندگی پائے جا سکتے ہیں، نظامِ حق، یا نظامِ باطل۔ جہاں نظامِ حق نہیں پایا جاتا ہے۔ نظامِ اسلامی کی غیر موجودگی میں ابلیسی نظام کو خود بخود قبضہ مل جاتا ہے پھر فرعون نمرود اور بوجہل کا سکہ چلنے لگتا ہے۔ جو اپنے مشیروں، مددگاروں، باریوں، حاشیہ نشینوں اور اپنے دوستوں اور ہمدردوں یعنی اہل سجادہ اور اہل سیاست کی مدد و تعاون سے کچھ نہایت پر فریب نظریئے اور فلسفے کی بنیاد پر ایک تہذیب کو جنم دیتے ہیں جس کا مرکزی موضوع ان آقاؤں کی خدمت و عبادت ہوتا ہے۔ اس غیر اسلامی تہذیب میں اقتدارِ خداوندی پر ان کا غاصبانہ قبضہ و تسلط ہوتا ہے اور خلق خدا کی گردنیں ان کی سواریاں ہوتی ہیں سیکڑوں صدیوں سے خوگرِ غلامی کے عوام کے لئے یہ اپنی خواجگی

کے مکر و فن کا جال اپنے پورے دائرہ اثر و مملکت میں بچھا دیتے ہیں تاکہ فسوں زدہ عوام ان کی خدمت و عبادت کو ہی اپنی زندگی کا مدعا سمجھیں۔ وہ اپنے مکر و فن خواجگی یعنی دانش و علم و فن بندگی ہوس تمام، سے اس بات کا پورا انتظام و اہتمام کرتے ہیں کہ۔

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

ایسے ماحول میں جب کوئی بیدار ہوں دل جس کی فغان سحری سے، اس مکر و فن خواجگی، کا پردہ فاش کرنا چاہتا ہے خدا کے سادہ دل بندوں کو حقیقت حال سے واقف کرنا اور انھیں تاریکی سے روشنی میں لانا چاہتا ہے تو اندھے بیٹوں کو کچھ نظر آتا ہے نہ کور چشم بیویوں اور باپوں کو کچھ دکھائی دیتا ہے۔

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

باپ، بیٹے، شوہر، بیوی، ماں، بیٹی، بہن، بھائی، بچے، بوڑھے، عورت مرد، عوام، خواص سب مل کر کوئی معاشرہ اور قوم بناتے ہیں۔ ان میں بہت بڑی اکثریت عوام الناس کی ہوتی ہے۔ عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت عموماً سادہ دل ہوتی ہے خواص جن میں سلطان و درویش بھی شامل ہوتے ہیں بہت چھوٹی اقلیت میں ہوتے ہیں مگر باطل معاشرے میں یہ بڑے چالاک عیار، مکار اور بے ضمیر ہوتے ہیں اور اپنی انھیں خصوصیات کی بنا پر یہ خواص میں شامل ہوتے ہیں۔ خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر سب ہی اپنے اپنے پجاریوں سے۔

(شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پوجتے ہیں کعبہ کے برہمن)

خراج اور نذرانے وصول کرتے ہیں۔ بے چارے سادہ دل عوام ان سب کی خدمت و عبادت اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں ؎

خوار ہوا کس قدر آدم یزداں صفات !

افسوس صد افسوس !

؎ سکندری ہو قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

سادہ دل عوام اپنی انتہائے سادگی سے ان برگ ہائے حشیش کو شاخہائے نبات سمجھ کر ان سے عشق کرتے ہیں حالاں کہ غیر خدا سے عشق زہر ہلاہل ہے جب کہ خدا سے عشق انسانیت کی معراج ہے اس بیماری عشق میں مبتلا عوام جن میں کوئی ہلاک جادو سامری اور کوئی قتیل شیوہ آزری ہوتا ہے اگر اپنی اس غلامی و بندگی کی زندگی پر فخر کریں اور خوش ہوں تو تعجب کی کون سی بات ہے کہ یہی تو ان کا مزمن مرض ہے ؎

جادوے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری

ایسے میں اگر کوئی دانا و بینا اٹھ کر قوم کے افراد کو یوں خطاب کرے !

اس شراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

تو ان حالات میں اگر ہماری آنکھیں مشاہدہ کریں کہ نوح کا بیٹا اپنے باپ کا مخالف ہے۔ لوط کی بیوی اپنے شوہر کی انکاری ہے ابراہیم کا باپ اپنے بیٹے کی بات پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں، ابو لہب اپنے بھتیجے پر ایمان نہیں لاتے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے !

ایک ایسے ساحرانہ نظام کے علماء، حکماء، سیاست داں، تجار بھی اس فکر کے محافظ ہوتے ہیں جس نظام میں نسل، قومیت، کلیسا، تہذیب، رنگ کے بت عوام کے لئے مسکرات کا کام کرتے ہیں۔

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

ایسے ماحول میں جب کوئی صاحب دل نظر اٹھ کر بہ آواز بلند یہ اذان

دیتا ہے "تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے" تو نادان عوام لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں !

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا آبِ حیات

یہ ذرا بھی تعجب کی بات نہیں ہے کہ نہ صرف ابوجہل بلکہ پورے شہر مکہ نے محمد کے خلاف تلوار اٹھالی جیسے ہی ان کے زبان حق ترجمان سے یہ الفاظ سنے گئے :

"لا الٰہ الا اللہ" ـــــ یعنی بہ زبان شاعر اسلام ؎

" قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے"

شہر مکہ، کے عوام و خواص، رند و فقیہہ، میر و پیر، محمد کے ساتھ جس طرح پیش آئے، ان کے چند ساتھیوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا وہ عین متوقع تھا۔ ۱۴ سو سال پہلے پیر فلک نے مکہ میں جو کچھ دیکھا تھا وہی کچھ آج بھی ہے آج کی ترقی یافتہ اور آزادی کی دلدادہ دنیا میں بھی چشم سر سے دیکھ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ملا کی نہیں مجاہد کی یہ اذاں بلند کریں "قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے" کیوں کہ مشرق و مغرب کا یہ دعوئ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے، محض ڈھول کا پول ہے۔

اسی طلسم کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اسکی ہیں ابتک بتان عہدِ عتیق

آج بھی اگر آپ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں لانا چاہیں تو " خواجگی " مار مار کر آپ کا کچومر نکال دے گی اور عوام آپ کا تماشا دیکھتے رہیں گے کیوں کہ آج بھی عوام الناس کو اپنے برے بھلے کا ہوش نہیں ہے تہذیب فرنگی نے ہر طرف ہر جگہ اپنے قدم مضبوط جما رکھے ہیں۔ اس جاہلی تہذیب کے رنگ میں معاشرے کا معاشرہ رنگا ہوا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کا نعرہ ان جاہل کالوں سے ٹکرا کر واپس آجاتا ہے ؎

تیرے پیمانوں کا ہے اے مئے مغرب اثر
خندہ زن ساقی بساری انجمن بے ہوش ہے

ماضی قریب میں مصر میں سید قطب شہید اور ان کے کچھ ساتھیوں نے آزادی کا یہی نعرہ "قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے" بلند کیا تھا تو شکاری نے انھیں ذبح کر دیا تھا اور شکار خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔

جاہلی شراب کا اثر زائل کرنے کا اور انجمن کو ہوش میں لانے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ وہی طریقہ ہے جسے ۱۴ سو سال پہلے حضرت محمد نے اختیار کیا تھا۔ جو سید قطب شہید کی زبان میں یہ ہے۔

"اگر انسان کی عملی زندگی اسلام کے مذکورہ اعلان آزادی کے خلاف پائی جاتی ہو تو اس صورت کے ازالے کے لئے ناگزیر ہے کہ اسلام بیک وقت تبلیغ و تحریک دونوں پہلوؤں سے میدان میں اترے اور ان سیاسی طاقتوں پر کاری ضرب لگائے جو انسانوں کو غیر اللہ کی چوکھٹ پر سر افگندہ کرتی ہیں اور اللہ کی شریعت سے بے نیاز ہو کر ان پر حکمرانی کرتی ہیں اور اسلام کی دعوت لوگوں کے کانوں تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ عقیدہ اسلام کا انتخاب بھی کرنا چاہیں تو انھیں یہ آزادی نہیں ہوتی کہ وہ برسرِ اقتدار طاقت سے بے خوف اور بے نیاز ہو کر اسے قبول کر سکیں۔

"تبلیغ و تحریک دونوں حیثیتوں سے اسلام کا در کار آنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلام ملک خدا کو طاغوتی طاقتوں سے پاک کرنے کے بعد ایک ایسا معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام قائم کر سکے جو تحریک آزادی انسان کو عملی جامہ پہنائے اور دنیا کے اندر اسے فروغ دینے میں ممد و معاون ثابت ہو" شاعر اسلام بھی اس نقطۂ نظر کی ہمنوائی کرتے ہیں ؂

ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگین دل و آئینہ رو

ہم نے اپنے معبود برحق کے آگے بطور شکر سر بسجود ہیں کہ زمانے کے سینکڑوں نشیب و فراز کے بعد ایشیا کی خاک سے اب ایسے مجاہدین اٹھ رہے ہیں جو چیتے کا جگر شاہیں کا تجسس اور پہاڑ جیسا ثبات عزم رکھتے ہیں جنھوں نے عصاء لا الٰہ

سے خواجگی کے بت سنگین دل و آئینہ رو کو ضربت پیہم سے پاش پاش کر ڈالنے کا
نیز اس کرۂ ارض کی تقدیر بدل دینے کا پختہ عزم کر رکھا ہے خدا کے ان سپاہیوں
کو اس کافر ہندی کا صد ہزار صلوٰۃ و درود کے ساتھ یہ مژدۂ جانفزا مبارک باد
کہ ان کی اذان سے وہ سحر جس سے لرزتی ہے شبستان وجود نمودار ہونے کو ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

مومن امت مسلمہ کی ایک اکائی کا نام ہے۔ وہ مومن جو "قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" ایسی تمام اکائیوں کے مجموعہ سے امت مسلمہ وجود میں آتی ہے۔ اسلئے وہ امت مسلمہ مجموعی حیثیت سے بھی "قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" کی سچی تصویر ہوتی ہے۔

زیاد بن لبیدؓ کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک (خوفناک) چیز کا ذکر فرمایا اور کہا کہ یہ اس وقت ہو گا جب کہ (دین کا علم) اٹھ جائے گا۔ میں نے کہا۔ یارسول اللہ! علم کیسے مٹے گا جب کہ ہم قرآن پڑھ رہے ہیں اور اپنی اولاد کو پڑھا رہے ہیں اور ہمارے بیٹے اپنی اولاد کو پڑھائیں گے؟ آپ نے فرمایا تمہیں تمہاری ماں روئے اے زیاد! میں تمہیں مدینہ کا انتہائی سمجھ دار آدمی سمجھتا تھا کیا یہ یہود و نصاریٰ توریت اور انجیل کو نہیں پڑھتے مگر ان میں سے کسی چیز پر کچھ بھی عمل نہیں کرتے۔ (ابن ماجہ)

ایک ایسی امت جو قرآن کو نہ صرف پڑھے بلکہ اسے قائم بھی کرے، جو قاری ہی نہیں بلکہ قرآن بھی ہو، اس وقت کہیں موجود نہیں ہے اور موجودہ امت مسلمہ سے یہ اولیں مطالبہ ہے کہ وہ اس خالی جگہ پُر کرے۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کے نام سے جو جماعت بنائی تھی اور جس کی قیادت وہ خود فرما رہے تھے۔ کچھ خصوصیات کی حامل تھی جو اس نے اپنے قائد کی نگرانی میں اپنے اندر صفات قرآنی پیدا کی تھی اس ملت کے افراد نے آزادی

کا صحیح مفہوم سمجھا تھا اور انھیں آزادی کے صحیح مفہوم کی تربیت دی گئی تھی انھیں بتایا گیا تھا کہ آزادی ان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے جس کی حفاظت ان کی زندگی کا واحد نصب العین ہے وہ جان دے سکتے تھے مگر آزادی کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن ❁ نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

تہذیب حاضر کی قومیں، سب کی سب جب فخریہ اپنی آزادی کا راگ الاپتی ہیں تو مجھے ان کی تنگ ذہن پر ترس آتا ہے۔ کتنی نادان ہیں بے چاری! شاخ حشیش کو شاخ نبات سمجھ کر اترا تی پھر رہی ہیں۔ حالانکہ انھیں گلشن آزادی کے باد نسیم کی ہوا تک بھی نہیں لگی ہے۔ ؎

تجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

اشتراکیت ہو یا سرمایہ داری یا کوئی اور "ازم" سب نے گرفتاری کو آزادی کا نام دے رکھا ہے۔ جب کہ آزادی۔ حقیقی آزادی۔ اسلام۔ صرف اسلام میں ہے۔ اسلام دین آزادی ہے۔

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانہ میں تیرا امتحاں ہے زندگی

مومن کی یہ آزادی باطل کے لئے چیلنج ہے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گوارہ نہیں ہے کہ مومن آزاد فضا میں اپنی شخصیت کو پروان چڑھائے۔ چنانچہ وہ طلسم سامری سے مسلح ہو کر اس کی آزادی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس ستیزہ کاری میں اگر اسے جزوی کامیابی بھی حاصل ہو جائے تو وہ بتان آذری کو لا گھساتا ہے خدا کی اس بخشی ہوئی آزادی میں بتان آذری کے لئے جگہ نکالنا شرک ہے۔ خدا کا مومن، شرک کا اور تمام بتان آذری کا ازلی دشمن ہے کیونکہ یہ سب اس کی آزادی کے دشمن ہیں۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے ❁ شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی عطا کردہ آزادی ہے کیا ؟

ہادی اعظم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو پیغام آزادی دیا ہے اس کی تعبیر اس طرح کی جا سکتی ہے۔

" غلامی کے مادی و خیالی تمام بندھنوں کو کاٹ کر پھینک دو نہ مانو کسی کا بھی حکم، نہ بنو کسی کے بھی غلام نہ کرو کسی کی بھی اطاعت۔ تم میں نہ کوئی چھوٹا ہے، نہ بڑا، نہ کوئی کسی سے کم ہے نہ زیادہ۔ نہ کوئی کمتر ہے اور نہ کوئی برتر ــ پھر اپنے جیسے کی اطاعت کیوں ؟ پھر اپنے جیسے کی عبادت کیوں ؟ اپنے جیسے کا سجدہ کیوں ؟ اور جو کچھ زمین آسمان میں ہے ــ فرشتے ہوں یا چاند یا سورج، یا کچھ اور۔ یہ سب تمہارے لئے صرف تمہارے لئے ہیں۔ پھر ان کی عبادت کیوں ؟ ان کی بندگی کیوں ؟ اپنے خدمت گاروں کی غلامی کیوں ؟ زمین و آسمان میں کسی کی بھی غلامی کرنا تمہاری توہین ہے، تمہاری انسانیت کی توہین ہے۔ مگر ان ہزار سجدوں سے نجات پانے کا ایک۔ صرف ایک نسخہ ہے ــ ایک اور صرف ایک ــ اور وہ یہ ہے اپنے سے کمتر یا اپنے جیسے کے سجدے سے انکار یکسر انکار ــ کیونکہ بڑا صرف ایک ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

" وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب اور حاضر ہر چیز کا جاننے والا وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس سراسر سلامتی، امن دینے والا نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ (الحشر آیت ۲۲۔ ۲۳)

مگر دنیائے انسانیت کا یہ ایک زبردست المیہ ہے کہ اسے ہزاروں بتان آذری کے سجدے آسان معلوم ہوتے ہیں مگر ایک کو سجدہ کرنے میں اس پر قیامت گذر جاتی ہے۔ یعنی اس ایک کا سجدہ جو اس سے بالا و برتر، اس کا خالق و مالک، اس کا

آقا و حکمراں ہے ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ✿ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

اس احساسِ زیاں کے جاتے رہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں اسے آزادی سے حقیقی لذت آشنا ہونے کے بہت کم مواقع ملے ہیں اور نہ بتانِ آذری جن کے وہ سجدے کرتا رہا ہے اسے جامِ آزادی سے لذت آشنا ہونے دینا چاہتے ہیں۔ اور ہونے کیوں دیں؟۔ ایک کا سجدہ کرنے والوں کو جو لذت آشنائی ملتی ہے اس سے کچھ کم لذت ان بتانِ آذری کو مسجود بننے میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ✿ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

دنیا کو حقیقی آزادی کا سبق پڑھانے والا یہ رہبر بھی کیا خوب رہبر ہے۔ پیرِ فلک نے ایسے رہبر بہت کم ہی دیکھے ہیں جو آزادی کا درس دیتے ہوئے اپنے لئے کچھ مارجن نہ رکھ لیتے ہوں، جن کے لینے اور دینے کے پیمانے ایک ہی ہوں۔ اس کے پیمانہ آزادی میں سب یکساں اور اہم ہیں۔ کیوں نہ ہوں؟ اس کا میزانِ آزادی تو اسی ایک سجدے والے کا عطا کردہ ہے! یہی میزان وہ خود اپنے لئے رکھتا ہے اور اپنوں کے لئے بھی اور غیروں کے لئے بھی، دی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہے۔ شخصیتوں پر قانون کی بالاتری کی اس سے بہتر مثال دنیا کے سامنے پیش ہے چودہ سو سال پہلے آزادی اور مساوات کا یہ گرانقدر اصول دنیا کے سامنے پیش کیا گیا مگر افسوس، ابھی تک انسانیت کا ظرف اتنا وسیع نہ ہو سکا کہ اسے اپنی زندگی میں سمو لیتا حیرت اور افسوس تو ان مسلمانوں پر ہے جو اس گوہرِ آبدار کی چمک دمک پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

حسی معجزات رکھنے والے گذشتہ انبیائے کرام کی جو تصویریں کافروں نے اپنے ذہنوں میں بنا رکھی تھیں انھیں سامنے رکھ کر وہ توقع رکھتے تھے کہ خدا کا رسول جداگانہ ہیئت و جنس کا مالک محیرالعقول حسی معجزات رکھنے والا کوئی فوق البشر ہستی ہونی چاہیے۔ جو ان کے عقل و ضمیر کو مطمئن کرنے کے بجائے انھیں سلب کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہو مگر وہ انھیں ایسا نہ پاکر، اس معیار

نہ پاکر مایوس ہو جاتے تھے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی آدمی کسی دینی سیاسی منصب پر فائز ہونے کے بعد انسان نہیں رہ جاتا؟ کیا ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضوان اللہ علیہم منصب خلافت علی منہاج النبوت پر آجانے کے بعد انسانیت کی فہرست سے خارج ہو گئے؟ کیا تمام دنیا کے انسان باہم ایک دوسرے جیسے نہیں ہیں؟

آخر لوگوں میں اتنا احساس کمتری کیوں ہے؟ رسول اللہ تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانے کے لئے اور احساس کمتری، نیز احساس برتری ختم کرنے کے لئے آئے تھے۔ سب لوگوں کو آزادی اور مساوات دینے آئے تھے مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو انسانی برادری میں انسانوں میں احساس کمتری پیدا کر کے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اس کمزوری کو سمجھیں اور اپنے کو مزید استحصال سے بچائیں۔ اللہ کے رسولؐ نے انسانیت کو بہت بلند فرمایا ہے۔ انھوں نے تو اپنے دشمنوں کی بشریت کو بہت بلند کیا ہے۔

تو آپ کے ماننے والے اپنی بشریت کو کیوں کمتر سمجھیں؟

آزادی اور مساوات دراصل ایک ہی حقیقت کی دو شکلیں ہیں۔

آزادی میں مساوات کا پایا جانا ضروری ہے اور مساوات اسی وقت دیکھنے میں آسکتی ہے جب آزادی اپنی اصل شکل میں موجود ہو۔ اس بات کا ثبوت دیکھنا ہو تو تہذیب حاضر کی ترقی یافتہ آزاد قوموں میں تلاش نہ کیجئے۔ ان کی ہر چیز مصنوعی ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

یہ اس قوم میں ملے گی جس میں اللہ کا رسول اپنے دشمنوں سے فرما رہا ہے میں بھی بندۂ خدا ہوں۔ وحدت کو ماننے والی یہ قوم صرف خدائے واحد کی غلام ہے۔ اس کے ذہن میں غیر خدا کی غلامی کا سایہ تک کبھی نہیں پایا جاتا۔ اس

کی ایک ادنیٰ مثال ہمیں بدر کے میدان میں ۔ آزادی کی پہلی مدافعانہ جنگ میں نہایت نازک موقع پر ملتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ماہر القادری سے سنیئے :۔

صبح کے نماز کے بعد رسول اللہ نے جہاد کے لئے وعظ ارشاد فرما کر جانثاروں کے قلوب کو گرما دیا۔ ایک ایک لفظ پر سرفروش مجاہد اچھل اچھل پڑتے۔ اس کے بعد جنگ کے لئے صف آرائی ہوئی حضور نے خود صفیں درست کرائیں۔ دست مبارک میں کھجور کی ایک شاخ تھی اور اس کے اشارے سے صفوں کو درست کرنے کا حکم دے رہے تھے۔ سودہ ابن عرمہ ایک خوش طبع صحابی تھے۔ اتفاقاً ان کے قدم صف کی حد سے آگے نکل گئے اور صف ٹیڑھی ہو گئی۔ حضور نے چھڑی سے ان کے سینے کو ٹھوکا دیا کہ دوسروں کی طرح صف باندھ کر سیدھے کھڑے رہو۔ سودہ نے اس پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خدائے تعالےٰ نے آپ کو حق و صداقت پر مبعوث فرمایا ہے اور انصاف کے لئے آپ دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ میرے سینے پہ آپ نے چھڑی کی جو ضرب لگائی ہے اس کا میں انتقام لوں گا۔ حضور نے سینے سے چادر ہٹا دی اور فرمایا۔ "اے سودہ قصاص لے!

اللہ اللہ! اس وقت کا قصاص، ہر وقت کا سب سے عظیم انسان قصاص دینے کے لئے اپنا بند قبا وا کر دیتا ہے۔ یہ کوئی الف لیلیٰ کی داستان نہیں ہے۔ یہ واقعاتی دنیا میں آزادی اور مساوات کا عملی سبق ہے جو ایک قائد اور وہ بھی خدا کا رسول اپنے کردار سے قوم کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ وہ اپنی قوم کے ذہن نشیں کرتا ہے۔

اوّل یہ کہ قانون کی بالادستی سب پر لاگو ہوتی ہے یہاں تک کہ سراپا قانون پر بھی۔

دوم یہ ہے کہ دنیا ایسی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ رشتہ نکاح میں منسلک ہیں۔ مگر مزاج

میں مطابقت نہیں ہے۔ زیدؓ طلاق دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ رسول اللہ کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ سمجھاتے ہیں کہ طلاق نہ دو مگر حضرت زید کوئی بات قبول نہیں کرتے اور طلاق دے دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیدؓ کی یہ ادا جس کا تعلق خدا کی بخشی ہوئی آزادی کی حفاظت سے ہے، شرف قبولیت پا جاتی ہے اور ان کا نام وحی میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ کی صحابیوں میں تنہا آپ ہی خوش قسمت صحابی ہیں جن کا نام قیامت تک قرآن مجید میں تلاوت کیا جاتا رہے گا۔ یہ انعام، یہ سرفرازی، یہ ہمت افزائی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی یہ قدر دانی آخر کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ انھوں نے خدا کی عطا کردہ آزادی کی حفاظت کی آزادی کے اس عملی اقدام کے مقابلہ میں آسمان کی بلندیاں نیچے ہیں۔ اقوامِ عالم کے تصورِ آزادی کا اسلام کے پیش کردہ تصورِ آزادی سے کیا مقابلہ!

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

مدت ہائے دراز سے بتانِ آذری کی عبادت کرتے کرتے لوگوں کا ذہن اسلام کے بلند اور ناپیدا کنار تصورِ آزادی کا متحمل ہی نہیں ہو پاتا جس کا نتیجہ آزادی اور مساوات کی غلط تاویلات میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا ذہن یہود و نصاریٰ کی طرح الوہیت اور رسالت کو ملا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اور قرآن اور سنت کے دیے ہوئے فاصلے کو ختم کر دینا چاہتا ہے ؎

خراب کر گئی شاہیں بچوں کو صحبتِ زاغ

خدا اس امت کو مثالی امت بنانا چاہتا ہے جس کے لئے اس میں مثالی ڈسپلن کا پایا جانا ضروری ہے آپس میں چلا چلا کر باتیں کرنا خصوصاً قائد سے کہاں کی تہذیب ہے؟ اور بے ضابطگی جاہلی معاشرے میں تو جگہ پا سکتی ہے مگر ایک آزاد معاشرے میں اس کا گذرنا ممکن ہے۔ یہ آزاد معاشرے کے لئے خطرہ کا نشان ہے۔ ایسے معاشرے کی آزادی جس میں نظم و ضبط کی کمی ہو ہر وقت خطرے میں ہے

آزاد معاشرے میں قائد اور عوام دونوں ایک دوسرے کا خیال، ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے رفیق ایک دوسرے کے شریک شادی و غم ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

محبت ایک مطلوبہ بشری صفت ہے۔ یہ مساوات کی ضد کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ اس سے مساوات کو غذا ملتی ہے۔ یہ آزادی انسان کی نگراں ہے مگر اسے اسی حد میں رہنا چاہئے جس حد تک یہ آزادی فرد کی نگراں رہے اس حد سے تجاوز کرنے پر اسلام روک لگاتا ہے۔ غیر خدا کی محبت 'خدا کے محبت کے تابع ہونا چاہئے۔

یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں
کہ مرد حق ہو گرفتار حاضر و موجود

مسلمانوں کے زوال اور پستی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ کافروں کی طرح آفاق میں گم ہو گئے ہیں۔ وہ دنیا کی محبت میں اس طرح مبتلا ہوئے کہ خدا کی محبت پس پشت پڑ گئی۔ جب تک غیر خدا کی محبت خدا کے تابع تھی، امت مسلمہ آزاد تھی مگر جب غیر خدا کی محبت خدا کی محبت پر غالب آگئی امت مسلمہ غلام ہو گئی اور یہ سلسلہ آج تک دراز ہے۔ اگر صورت حال میں تبدیلی آجائے یعنی خدا کی محبت کو پھر اس کا صحیح مقام مل جائے تو ہماری کھوئی آزادی پھر ہمیں واپس مل سکتی ہے۔

اسلام کا مقصد نوع انسانی کو حریت اور مساوات کا سبق پڑھانا ہے اس کا نعرہ غریبی ہٹاؤ نہیں، شکم پروری اس کا پیغام نہیں، نہ اس کے لئے کوئی مسئلہ۔ اس کا پیغام آزادی دل ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ دل کی آزادی کی قوت سے زمین کے جگر کو چاک کر کے شکم پروری کے سارے خزانے نکال لینے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتا ہے۔ تمام معبودان باطل سے آزادی کا کلمہ لا الہ الا اللہ ہے یعنی سے بہرہ کرانا ہے۔

مسروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

اسلام میں مذہبی و سیاسی و معاشی ہر قسم کی ربوبیت و حکمرانی خدائے بزرگ و برتر کے لئے ہے اسلامی نظام میں بتان آذری کی الوہیت اور حکمرانی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ معاشرہ بتان آذری سے بالکل پاک و صاف ہوتا ہے۔ بتان آذری کی جگہ جاہلی نظامہائے زندگی میں ہے جب کہ اسلامی معاشرے میں ذات بے ہمتا کے سوا اور کوئی بڑا نہیں ہے۔

" فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

(یوسف آیت ۴۰)

جب ذات بے ہمتا کے علاوہ کوئی بھی بڑا نہیں ہے تو پھر کوئی بڑا کیوں بنتا ہے؟ پھر یہ اونچ نیچ کیسی؟ پھر کوئی کیوں کسی پر اپنا حکم چلاتا ہے؟ کوئی کیوں کسی کو اپنا غلام بناتا ہے؟ کسی پر بھی بتان آذری کا حکم چلنے نہیں دیا جائے گا۔ کسی کو بھی بڑا تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ بڑائی کا مالک تو صرف اللہ ہے۔ جب اس بڑائی میں اللہ کا رسول بھی شریک نہیں ہے تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ بڑائی میں اپنے کو شریک کرے یہ بڑائی وہ ہے جس کا اعلان ہر اذان میں " اللہ اکبر " پکار کر کیا جاتا ہے مسلم معاشرے کی سربراہی جن لوگوں نے کی ہے اور جن کی سربراہی ہمارے لئے اسوۂ نمونہ ہے اس کی ایک مثال یہ ہے :-

جنگ فتح بیت المقدس کے موقع حضرت عمرؓ اس وقت کی امریکہ جیسی مملکت کے صدر۔ مدینہ سے بیت المقدس کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ سواری کے لئے صرف ایک اونٹ اور ساتھ میں غلام ہے ضرورت کا سامان ہونے کی وجہ سے اونٹ پر صرف ایک سواری کی جگہ ہے۔ چنانچہ سربراہ

اور غلام ــ جی ہاں غلام ــ ـــ تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی ــــ باری باری اونٹ پر سواری کرتے ہیں یہاں تک کہ بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت غلام اپنی باری پر اونٹ پر سوار ہے اور سربراہ مملکت اونٹ کی نکیل تھامے پیدل آگے آگے چل رہا ہے۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیل ملکوتی وجذبہ ہائے بلند

مگر دنیا پرست لوگوں کی کوششوں سے قرآن اور سنت اور خدا پرست لوگوں کے ہوتے ہوئے امت مسلمہ کے ذہن میں دھیرے دھیرے "موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے" کا تصور اصولی اور عملی حیثیتوں سے ماند پڑتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم معاشرہ جاہلی معاشرے کی طرح نئے نئے لات ومنات کا مسکن بن گیا۔ مسلمان کلمے کا ورد کرتے رہے۔ نماز روزہ اور حج ادا کرتے رہے اور زکوٰۃ قربانی بھی دیتے رہے مگر وہ ان عبادات کی لذت سے ناآشنا ہی رہے۔

قبول حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں

دنیا کی موجودہ صورت حال ایسی ہے جس میں انسانیت غلامی کے بوجھ تلے دب کر سسک رہی ہے وہ اپنی زندگی کی بقا کے لئے، انسانیت کی بقا کے لئے آب حیات کی تلاش میں حیران اور سرگراں ہے مگر مخالفین آزادی مستشرقین کے پروپگنڈے نیز اہل حرم کی جفائے وفانما کی وجہ سے اسے آئین پیغمبر سے ایک طرح کی کد ہو گئی ہے اسلام کا پیغام آزادی اس کے دل کی پیاس بجھانے کے لئے آب حیات فراہم کرتا ہے مگر اس کی تنگ نظر قوم پرستی بڑھ کر اس جام کے اٹھا لینے میں مانع ہو جاتی ہے کہ یہ تو عربی جام ہے۔

بادہ گردان عجم وہ عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

غلامی کی اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں دنیا کے مختلف حصوں میں تحریک آزادی

کی کچھ کرنیں نمودار ہو رہی ہیں۔ ان تحریکوں میں خون صد ہزار انجم سے سحر پیدا کرنے کا پہاڑوں جیسا عزم پایا جا رہا ہے۔ ان کے جہاد "باز مانہ ستیز" سے تاریخ اپنے کو دہرانے پر مجبور ہے۔

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جواں مرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی ادھر جا

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے اس آزادی کی حفاظت کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رب الناس، ملک الناس، الٰہ الناس نے اپنے مومن بندوں کو اس دعا کی تکرار کا حکم دیا ہے۔

"ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش۔"

جواں لات و منات کی موجودگی میں تنہا خدا کی عبادت، اطاعت و فرمانبرداری انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لئے ایک مرد آزاد اس کے علاوہ اپنے خدا سے اور کیا تمنا رکھ سکتا ہے کہ وہ تنہا اسی کا ہو کر رہے اور اس شعور کو ہر دم تازہ رکھنے میں اپنے خدا سے مدد چاہے ؎

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

تفہیم تقدیر

غیر قوموں کا کیا ذکر، انھیں تو امراضِ گوسفندی سے لب گور ہونا ہی چاہئے۔ افسوس تو امت مسلمہ پر ہے۔ جو نسخۂ شفا رکھتے ہوئے بھی ان بیماریوں میں مریض ہو کر بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہے وہ اس نسخۂ شفا کو استعمال کر کے نہ خود شفا حاصل کرتی ہے۔ اور نہ اسے دوسروں کے حوالے کرتی ہے کہ دوسرے اسے استعمال کر کے شفا حاصل کریں۔ مار گنجینہ کے بارے میں سنا تھا۔ دیکھا نہ تھا، سو امت مسلمہ کو دیکھ لیا ہے۔ اس نسخۂ شفا کا ایک جزو تقدیر بھی ہے اس کا استعمال اگر صحیح ہو تو شفا ہے۔ نہ ہو تو بیماری۔ اس لئے اس جزو کی معرفت حاصل کرنا دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے نہایت ضروری اور مفید ہے:

انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ وہ خدا جو اس کائنات کا خالق و مالک (اور فرماں رواں ہے اسی خالق و مالک و فرمانروا نے) انسانوں کو لامحدود مگر محدود قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں تاکہ وہ خلافت کے فرائض کما حقہٗ انجام دے سکے۔ بادشاہ کی طرف سے اسے انتخاب و ارادے کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔ تصرف کے اختیارات ملے ہوئے ہیں۔ یہ سب داد و دہش، اختیارات و آزادی بر ائے امتحان ہیں کہ وہ ان کی مدد سے کس حد تک فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہوتا ہے اگر اس نے خلافت کے فرائض کو صحیح اور بہترین طریقے سے انجام دینے کی اپنی جیسی بھرپور کوشش کی تو وہ امتحان میں کامیاب ہے۔ نتیجۃً اس کا لامتناہی مستقبل شاندار ہے مگر مسئلہ تقدیر کا صحیح فہم نہ ہونے سے ان فرائض کی انجام دہی صحیح اور بہترین طریقے پر نہیں ہو سکتی جس کے نتیجہ میں اس کا لامحدود مستقبل خطرے میں

پڑ سکتا ہے۔

خدا کی خلافت کے فرائض انجام دینا اسلام ہے اور ان فرائض کے انجام دینے والا مسلمان کہلاتا ہے۔ مسلمان خدا کے بخشے ہوئے اس منصب کو قبول کرتا ہے اور اس عالی شان منصب کے شایان شان اپنا طرز عمل متعین کرتا ہے کفر اس منصب کو رد کر دیتا ہے۔ اور جو اپنے خدا کو نائب نہیں مانتا اُس کے مطابق اپنا طرز عمل بناتا ہے کافر ہے۔ افسوس، مسلمان نہ اپنی اس پوزیشن سے واقف ہے اور نہ اپنی صلاحیتوں۔ اختیارات و آزادی کی خبر رکھتا ہے جب اس کے ذہن میں خود وحدانیت کا صاف ستھرا شایان شان تصور نہیں پایا جاتا تو اس کی نیابت کا صحیح تصور کہاں پایا جا سکتا ہے! لہٰذا تقدیر سے جس کا رشتہ خدا سے ملتا ہے کے بارے میں اس کا بے خبری کا شکار ہونا فطری بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سستی کاہلی اور بے عملی کا شکار ہے۔

میں نے ناداروں کو سکھلا یا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

شیطان نے مسلمانوں کی جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں تقدیر کا ایک ایسا تصور دیا جس سے وہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن ہیں۔ اس امت کے غربا اور مساکین اپنی حالتِ زار کے بہتر بنانے کا کوئی حوصلہ ہی نہیں رکھتے۔ اس بات پر انھیں پورا یقین ہے کہ خدا کا لکھا نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے نیز جو کچھ خدا نے ان کے بارے میں طے کر دیا ہے وہ بہر حال ہونا ہے انسان کوشش کرے یا نہ کرے نتیجہ بہر حال وہی ہوگا۔ جو بہت پہلے روز ازل اس کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے یہ حال تو اس وقت کے غربا و مساکین کا ہے مگر اس وقت کے امرا بھی کچھ بہتر سوچ کے حامل نہیں ہیں۔ انھیں اس بات کی فکر نہیں ہے کہ وہ اپنے مال سے ان غریبوں کی خستہ حالی کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ انھیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ ان کے مال میں دوسروں کا بھی حق و حصہ ہے جو انھیں ملنا چاہیئے

انھیں بس ایک ہی دھن ہے کہ ان کا دھن قارون کا خزانہ ہو جائے۔ دولت کے غلط استعمال سے آرام پسندی اور تعیش ان کا مزاج بن چکا ہے۔ یہ ہے آجکے مسلمان کا حال دنیا اس نے دوسروں کے لئے خالی کر دی ہے اور دوسروں کے کئے ہوئے شکار پر اس فریب خوردہ شاہیں کی گزر اوقات ہے۔ نادان شیطان سے فریب کھا کر زندگی کا مقصد کھو کر اپنی سستی عمل کو تقدیر کا نام دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ "میری جو حالت زار ہے یہ میری کمائی نہیں ہے۔ یہ تو خدا کی طرف سے ہے"

خبر نہیں کیا ہے نام اسکا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

یہ خود فریبی ہے اور خدا فریبی بھی۔ ایک ہی نہیں دوہرا جرم۔ مسلمان عمل کا نام ہے۔ خدا کی کتاب، خدا کا رسول، رسول کے اصحاب سب شاہد ہیں کہ مسلمان عمل کا نام ہے مگر اسی مسلمان کے پاس۔ آج کے مسلمان کے پاس عمل ہی نہیں ہے پھر بھی وہ مسلمان ہے! کیا کسی نے کسی ایسے لکھ پتی کو دیکھا ہے جس کے پاس دمڑی نہ ہو؟ کیا کوئی بادشاہ ایسا بھی ہوتا ہے جس کا حکم کسی پر نہ چلتا ہو؟ مگر میں نے ایسے مسلمان دیکھے ہیں جو عمل سے بالکل کورے ہیں یہ سب مسلمان جو مردم شماری میں مسلمان ہیں جو ہمارے گرد و پیش پھیلے ہوئے ہیں یہ سب کے سب ایسے ہی مسلمان ہیں۔

ان کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

غضب ہے مسلمان اپنے کو بھول گیا اپنی حقیقت کو بھول گیا پھر خدا اسے کیسے یاد رہ سکتا ہے! پھر اس میں اور جانوروں میں کیا فرق ہے؟ پھر تو اس زمین پر اس کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک ہونا چاہیئے "جانور اور مسلمان دونوں اپنی خودی سے ناواقف، دونوں بے عمل تو دونوں کا حشر ایک سا" ؟ اس میں منطقی نقص کہاں ہے؟ چنانچہ اسے اس کی بے عملی اور خود فراموشی کا پھل ذلت نکبت اور غلامی کے علاوہ اور کس شکل میں مل سکتا ہے؟ ببول کے درخت سے آم

کھانے کی تمنا رکھنا کس عقلمند کا شیوہ ہے۔ مسلمان نے تو اپنی تقدیر میں محکومی و مظلومی پسند کیا ہے پھر اسے اپنی تقدیر سے کیا شکوہ۔ وہ چاہے تو اپنی تقدیر میں عزت و آزادی پسند کر سکتا ہے مگر اس کے لئے اسے اپنے کو پہچاننا ہوگا۔ سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ جن قوموں میں زندہ رہنے کا شوق پایا جاتا ہے۔ وہ سرگرم عمل ہوتی ہیں۔ فرصت نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہوتی وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی ہوئی بام عروج پر پہونچ جاتی ہے اور ان کا مذاق اڑاتی ہیں جنھیں اپنی تقدیر یا حالت زار کا ماتم کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ ایسی قومیں ہی زندہ کہی جاتی ہیں خود امت مسلمہ بھی کبھی تاریخ کے کسی دور میں ایک زندہ قوم تھی اور صبح و شام عروج کی منازل طے کر رہی تھی۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

مگر آج وہی زندہ قوم مردہ ہو رہی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انھوں نے تقدیر کا مفہوم الٹ دیا ہے۔ زندہ امت مسلمہ تقدیر کا جو مفہوم لے رہی تھی آج کی مردہ امت مسلمہ اس کا برعکس مفہوم لے رہی ہے۔

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جنکی ارادوں میں خدا کی تقدیر

ملت اسلامیہ خدا کی نائب بنائی گئی ہے۔ اسے غیر خدا سے سکشت کھانے کے لئے نہیں اٹھایا گیا ہے چوں کہ وہ خدا کی نائب ہے اس لئے غیر خدا پر برتری رکھتی ہے۔ خدا کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اسی کے لئے ہے۔ اس کے قبضے و تصرف کیلئے ہے۔ اس کے استعمال و آرام کے لئے ہے۔ خدا کی مخلوق خدا کے نائب کے لئے ہے

ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تدبیر ہے تقدیر تری

مگر مسلمان ہونا شرط ہے۔ اگر وہ مسلمان ہے تو دنیا کی ہر قوت اسکے

اس کے سامنے دست بستہ حاضر ہے اس کی ہر تدبیر کو فرشتے کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے تیار ہیں وہ جو کچھ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ بدر کے میدان میں ۳۱۳ مسلمانوں نے جو چاہا وہی ہوا۔

بے شک خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اس کی مرضی کے خلاف کوئی پتہ ہل نہیں سکتا۔ جب اسے ہر شے پر ہر طرح کی قدرت حاصل ہے "تو ہوگا وہی جو وہ چاہے گا"، مگر مومن بھی تو وہی چاہتا ہے جو اس کا خدا چاہتا ہے۔ اس کی اور اس کے خدا کی رضا تو ایک ہی ہوتی ہے۔ جب آقا اور غلام کی رضا ہم آہنگ ہو تو پھر کون ہے جو غلام سے ٹکر لے سکے پھر اس کے زور بازو سے لوہا لینے کی کس میں تاب ہے؟

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جی ہاں! ـــــ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں ـــــ تقدیریں بدل گئی ہیں۔ مکے کی سرزمین پر جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں ایک انسان کامل اٹھتا ہے ـــــ تنہا ایک مردِ مومن اور چہار طرف تاریکی ہی تاریکی ہے مگر ۲۳ سال میں ـــــ صرف ۲۳ سال میں مکے کی ہی نہیں بلکہ سرزمین عرب کی بلکہ عرب و عجم کی تقدیر بدل کر رکھ دیتا ہے ـــ مومن نہ تقدیر کا غلام ہے اور نہ اس سے خوف زدہ یہ رویہ تو نباتات و جمادات کو زیب دیتا ہے وہ اس کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ مگر مومن تو جمادات و نباتات پر برتری رکھتا ہے، ان پر قبضہ و تصرف رکھتا ہے۔ وہ کیوں ان جیسا رویہ اپنائے! وہ کیوں کسی ایسی چیز کو اہمیت دے! اس کی نگاہ میں تو صرف حکم خدا مرضیٔ مولا کی اہمیت ہوتی ہے اس کو عملی جامہ پہنانا ہے یہی اس کا ایک کام ہے۔ اس کام کی راہ میں نہ وہ پہاڑ کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ سمندر کو۔ اس راہ کی ساری رکاوٹیں اس کے سامنے سمندر میں کائی کی طرح پھٹ جاتی ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

ابھی عرض کیا جا چکا ہے خدا اور اس کے مومن کی رضا ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ اس زمین پر اپنے خدا کی مرضی پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اسے خدا سے عشق ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی خواہشات کو خدا کے حکم میں گم کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ہر ارادہ پورا ہوتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا، کارساز

خدا کا منکر کوئی بلند مقصد حیات نہیں رکھتا۔ دنیا پرستی ہی اس کا مقصد حیات ہوتی ہے۔ دنیا پرستی اسے کمزور، بزدل اور موقع پرست بنا دیتی ہے چنانچہ جب بھی اس کا مقابلہ خدا پرستوں سے ہوتا ہے غلبہ خدا پرستوں کا ہوتا ہے بالآخر کافروں کی لگام مومنوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

مگر کبھی کبھی مومن کی زبردست آزمائش بھی ہوتی ہے۔ اس پر چوٹ پر چوٹ لگائی جاتی ہے۔ شکست پر شکست دلائی جاتی ہے کہ دیکھا اور دکھلایا جائے کہ کہاں تک وہ اپنے عشق میں سچا ہے۔

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

ان حالات میں وہ کبھی کبھی اپنے خدا سے درپردہ شکوہ کے زبان میں بصد ادب دیکھ ادایہ سوال کر دیتا ہے۔

یارب یہ جہان گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردان صفا کیش و ہنرمند

مگر خدا کا بندہ عاشق حالات سے بے پروا ہوتا ہے۔ اور وہ ذرا بھی مایوس نہیں ہوتا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ؎

نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خوار زمانے کبھی جوہر ذاتی

وہ اپنے مقصد وجود کا پورا شعور رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ نااہل سے قوت و جبروت چھین لے کیوں کہ قوت و جبروت اسی کا حق ہے وہ زمانے کا رونا نہیں روتا، وہ زمانے سے صلح نہیں کرتا بلکہ زمانے کو اس سے صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اسلام میں جہاد اس کا نام ہے۔ جہاد خدا کے عشق کی ایک شکل ہے۔ جب اس کا عشق اس کمال پر پہونچ جاتا ہے تو پھر وہ اس شعر کا مصداق بن جاتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا، کارساز

ایسی حالت میں اگر اس کیلئے حکم ہو جائے کہ۔

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

تو یہ عین متوقع ذرہ نوازی ہے۔

آج کل مسلمانوں پر غلط قسم کی رہبانیت کا غلبہ ہو گیا ہے۔ انھوں نے خدا پر "توکل" "اور" "تقدیر" کا ایسا مفہوم اپنا لیا ہے۔ جس سے رہبانیت کو تقویت مل رہی ہے۔ اور وہ دن بدن دنیا پر اپنا سایہ گھٹائے چلے جا رہے ہیں جس کے نتیجہ میں باطل کا سایہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی محسوس کریں وہ ابلیس کا طرز عمل اپنا رہے ہیں۔

حرف استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں، مگر تیری مشیت میں نہ تھا مرا سجود

ابلیس نے خدا کی جناب میں ایک غلطی کی۔ اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے معافی کی درخواست پیش کرنے کے بجائے وہ مزید ایک غلطی کا مرتکب ہوا اس نے

گستاخانہ رویّہ اختیار کیا اور کہا ـــــ آدم کا سجدہ میرے تقدیر میں لکھا ہی نہ تھا۔" باری تعالیٰ نے فرمایا۔

"کب کھلا تجھ پہ یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

مگر اب بھی اس کج رو و کج فہم نے اپنی غلطی کو تسلیم نہ کیا۔ اس نے جواب دیا۔

"بعد! اے تیری تجلی سے کمالات وجود"

اس کے اس جواب کے بعد ابلیس کی غلطی طشت از بام ہو جاتی ہے۔ اس کے فلسفۂ تقدیر کا قلعہ مسمار ہو جاتا ہے۔ خدا کے مومن بندوں کو ابلیسی نظریہ تقدیر سے اس طرح آگاہ کیا جاتا ہے۔

پستی فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے

کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام

ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

مسلمان اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے ابلیس کا سا طرز عمل اپنا رہے ہیں وہ اپنی خستہ حالی پر "تقدیر" کا رونا روتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی زبوں حالی ان کی کوتاہیِ عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ چاہیں تو آج بھی اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ ماضی حال مستقبل اس پر روشن ہے مگر اس کا علم کسی کے آزادی عمل کے لئے پابہ زنجیر نہیں ہے۔ جب تک اسے عمل کرنے کی مہلت ملی ہے وہ اپنے ہر ارادے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے آزاد ہے۔ وہ اپنے ہر عمل اور ارادے کا ذمہ دار ہے۔

تفہیم خودی

خودگرے، خودشکنے، خودنگرے، پیدا شد

(اسرار و رموز کے تناظر میں)

نیست در خشک و تر پیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود در کنم [1]

اقبال کی حکمت و فکر کا کمال دراصل اس کے مطلوبہ انقلاب میں مضمر ہے جو اس نے اسرار خودی اور رموز بیخودی میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اپنے دستور عمل کی اس کتاب کے ذریعہ ایک ایسے انقلاب کلی کا منصوبہ تیار کرتا ہے جو نہ صرف عوام بلکہ ملک کے دستور اور نظام کو بھی بالکل تبدیل کردے اور ان کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کرے۔ اس سلسلے میں اس کا ایک پروگرام ایک پاکیزہ منصوبہ ہے، جو خون ریزی اور بربریت سے بہت مختلف ہے۔ اقبال خدا کی مسلم زمین پر ایک ایسے صالح انقلاب کا متمنی ہے جس سے نہ صرف خدا کی خدائی نافذ ہو بلکہ انسان کو بھی اپنی قدر و منزلت کا اندازہ ہو جائے۔ اس نکتہ کے پیش نظر، اقبال فرد کی ذات سے اپنے انقلاب کے جامع پروگرام کو شروع کرتا ہے۔ اور اختتام ایک ایسی تنظیم یا صالح جماعت پر کرتا ہے، جو اس کے انقلاب کو آفاقیت سے ہمکنار کردے۔ یہ صالح جماعت، ایسے صالح سپاہیوں سے تشکیل پاتی ہے، جو نیک اور پاکیزہ سیرت افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور جس نے محمد عربی سے وفاداری کی قسم کھا رکھی ہوتی ہے۔ اس کے لئے لازم قرار پاتا ہے کہ انسان کی تاریک سے تاریک بستی میں چراغ ضمیر روشن کیا جائے اور بستی کی خوابیدہ آنکھوں پر آب جلال ڈالا جائے اور اس کے ساکن مجہول اور غلام ذہن کو برق خودی کا جھٹکا دیا جائے تاکہ اس طرح شاید وہ بیدار ہو جائے اور اپنی

---

[1] صحرائے شاعری کے تمام خشک اور تر درخت اور انکی لکڑیاں کارآمد اور سود مند ہیں۔ تازہ لکڑیاں مقام اعلان جہاد کا منبر تیار کرتی ہیں اور خشک لکڑیاں باغیوں کے لئے دار و رسن فراہم کرتی ہیں۔

عظمت وعلویت کے اسرار ورموز سے آگاہ ہوجائے۔

اقبال نے اپنی انقلابی فکر کی اس نزاکت کے پیش نظر انسان کی ایک جامع تعریف کی ہے جو اس کے نزدیک لفظ خودی کی تعبیر وتفسیر میں مضمر ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کے ایک خط کے جواب میں خودی کی تشریح میں اقبال رقم طراز ہیں، "انسان کے مرکز حیات کو ہم خودی یا شخص سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی حیات جب انسان میں جلوہ گر ہوتی ہے تو اسے ہم خودی کہتے ہیں۔" اسی خودی کو اقبال اسرار خودی میں شرار زندگی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے اس مرکز حیات، شرار زندگی یا خودی یا شخص کے بارے میں جو تفصیلات مہیا کی ہیں۔ اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ ۱۔ خودی، وحدت وجدانی، شعور کے روشن نقطے یا تعین ذات یا عرفان نفس کا نام ہے یعنی انسان کی شخصیت، نفس یا ذات میں خودی ایک مقام وحدت کا درجہ رکھتی ہے جس کا ادراک ذوق سلیم (وجدان) یا شعور کے روشن نقطہ سے ہی ممکن ہے۔ یہاں شعور کے روشن نقطہ سے بالغ شعور کی عام اصطلاح مراد نہیں بلکہ ایسا شعور جو تنویر باطنی (ضمیر کی پختگی) سے عبارت ہے مدعائے بیان ہے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است

۲۔ خودی انسانی فطرت کی لامحدود کیفیات کی شیرازہ بند، عہ "دفتر افعال را شیرازہ بند" اگر کوئی قوت مصداق ہے تو وہ خودی ہی ہے۔

۳۔ خودی اپنے عمل کی رو سے ظاہر ہے یعنی تمام اعمال وافکار کی عامل یا فاعل ہے جو اپنی حرکت سے ہر طرح کے اعمال وافعال کا اظہار کرتی ہے۔

۴۔ خودی اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے یعنی حواس خمسہ یا عقل کے ذریعہ اس کی بازیافت ممکن نہیں بلکہ اس کا ادراک وجدان باطنی سے ہی ممکن ہے ؎

عقل ندرت کوش و گردوں تاز چیست
خودی از کائنات رنگ و بو نیست

۵۔ خودی تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ یعنی انسان کی زندگی میں جو تجربات آتے ہیں یا جو کچھ یادداشت انسان کے پاس باقی رہ جاتے ہیں، سب کی امین اور محافظ خودی ہے۔

۶۔ خودی مخلوق ہے مگر اپنے عمل کی بدولت اس میں شان ابدیت پیدا ہو سکتی یعنی وہ لازوال ہو سکتی ہے۔ اور ؎

" خودی چوں پختہ گردد، لازوال است " کا مصداق بن سکتی ہے۔

۷۔ خودی حق ہے۔ یعنی انسانی زندگی نہ دھوکہ ہے اور نہ فریب اور نہ ہی کوئی باطل چیز بلکہ بنیادی اور اساسی حقیقت کا نام ہے جس کو اقبال نے اسرار میں "عشق حق آخر سراپا حق بود" سے تعبیر کیا ہے اور جس کی تفصیل گلشن راز میں یوں پیش کیا ہے:

خودی را حق بداں باطل مپندار
خودی را کشت بے حاصل مپندار
خودی را از وجود حق وجودے
خودی را از نمود حق نمودے

۸۔ خودی زماں و مکاں کی قیود سے بالاتر ہے۔ یعنی جب خودی جوہر نوری کی شکل اختیار کرتی ہے تو انسان کو اس مقام پر لے جاتی ہے، جو شان بندگی کا کمال ہے۔ اس مقام پر پہونچ کر انسان رگ مہ انجم کی حرکت کو بھانپ سکتا ہے ؎

حرکت اعصاب گردوں دیدہ ام
در رگ مہ گردش خون دیدہ ام

اقبال نے صاف لفظوں میں واضح کیا ہے کہ اصیل وقت کا جوہر

نایاب دراصل زندگی ہے، جو یہاں خودی سے عبارت ہے ؎

من چہ گویم سرِّ ایں شمشیر چیست
آب او سرمایہ درازِ زندگی است

۹۔ خودی (انائے مطلق) کے جلوے ہی چارسوں بکھرے ہوئے ہیں۔ زمین سے آسمانوں تک جتنے مظاہر قدرت ہیں سب خدائے کبیر کے مظاہر ہیں۔ عالم حیات ہو یا عالم انسان، عالم ظہور ہو یا عالم تکوین، عالم غیر مشاہد ہو یا عالم غیر محسوس سب اسی جل جلالہٗ کی قدرت جلیلہ کے مظاہر ہیں ؎

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

بے شک انسان کی سب سے بیش قیمت چیز اس کی خودی اور شخصیت ہے۔ یہ وہ جوہر نوری ہے جو انسان کی خاک کے اندر موجود ہے اور اس شعاع بیتاب کے ادراک کے لیئے اقبال بار بار انسان کو آگاہ کرتا ہے۔ اس گوہر کمیاب کا اثبات، عرفان اور تعین چاہتا ہے۔ اقبال کو یہ امتیاز و اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے اس شعلہ آبی (ناب خوری) کا جام نوش کیا اور اس سیال شعلہ کے طفیل میں ہی ان پر اسرار رموز کے دفتر سربستہ ہوئے اور حیات اقبال شعلوں کی آماج گاہ بن گئی اور نفس، مثل شرار آفتاب کی مصداق۔ خودی کا ہی کرشمہ تھا کہ اقبال چشمۂ حیوان کی دولت سے سرفراز ہوئے اور ان کو دنیا نے "محرم راز حیات" کے لقب سے یاد کیا۔ اسرار کے پردے میں ان کا بیان درست ہے ؎

چشمۂ حیواں برا تم کردہ اند
محرم راز حیا تم کردہ اند

اقبال اس چشمۂ حیوان یا مرکز حیات کا اثبات وحدت وجدانی

ہے کے توسط سے چاہتا ہے۔ صرف اتنا احساس کافی نہیں کہ میں موجود ہے بلکہ وجدان کی دولت بے بہا کے ذریعہ یہ یقین کامل لازم ہے کہ:

۱۔ میں اشرف المخلوقات ہوں اور خدا نے مجھے زمین کے لئے خلیفہ منتخب کیا ہے اور "اِنِّی جَاعِلٌ" کی شرح کی صورت میں ہوں۔ خداوند قدوس فرماتا ہے "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الاَرضِ خَلِیفہ" اقبال کلام الٰہی کی تشریح اس طرح کرتے ہیں ؎

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح اِنِّی جَاعِلٌ سازد ترا

۲۔ میں بہت عظیم ذات ہوں اور میرا وجود یا خودی گوہر نایاب ہی نہیں بلکہ باعث فخر کونین ہے ؎

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

۳۔ یہ کائنات میرے لئے تخلیق کی گئی ہے اور میرے لئے مسخر کر دی گئی ہے اور میری میراث ہے۔ قرآن اس امر کی تصدیق کرتا ہے "بیشک زمین صالح بندوں کی میراث ہے۔" اور مزید نشاندہی کرتا ہے "وسخّر لکم مّا فی السّمٰوٰتِ ومَا فی الارضِ جمیعًا مِنہ" "یعنی" اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب چیزوں کو تمہارا خادم اور مطیع بنا دیا ہے"

؏ جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
سبق ملا ہے معراج مصطفٰےؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

۴۔ اللہ نے مجھے فطرت سلیمہ سے پیدا کیا ہے، نہ میں پیدائشی گنہگار ہوں، نہ سابقہ بداعمالیوں کا شکار ہوں اور نہ ہی گذشتہ جرائم

کی پاداش میں سزا بھگت رہا ہوں بلکہ اللہ نے مجھے احسن تقویم میں اپنی فطرت کے تحت ہی پیدا کیا۔ قرآن میں دو مواقع پر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے،

۱۔ لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم

۲۔ فِطرتِ اللہ التی فطر الناس علیھا

۱۔ اقبال کہتے ہیں ؎

ذات ما آئینہ ذات حق است
ہستی مسلم ز آیاتِ حق است

۵۔ میں اپنی تقدیر کا خود معمار ہوں اس لئے ایک ذمہ دار ہستی ہوں ؎

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

ماضی، حال، مستقبل سب میری کوشش اور محنتوں پر مبنی ہے قرآن میں اس امر کی طرف "لیس للانسان الّا ما سعی اور لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت" کا واضح اعلان کر کے ہر فرد بشر کو پوری طرح اس کے تمام اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں ردِ عمل کا حساب

۶۔ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں جو میری خودی کی سلطنت کے زیرِ نگیں ہے۔ اس لحاظ سے مایوسی کفر ہے اور فطرت کائنات کی وسعتیں بھی میرے لیے تنگ ہیں۔ سورہ رحمٰن میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، اگر تم سے ہو سکے تو آسمانوں اور زمین کے کنارے کے پرے نکل جاؤ لیکن نہیں نکل سکتے بغیر قوت کے" اقبال بندہ آزاد کو ایک جہانِ دیگر اں کی تلاش میں سرگرداں ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور اگر یہ ممکن نہیں تو ؎ از ضمیرِ خود دگر عالم بیار"

کی مثال ہر آزاد بندہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس خیال کو اردو میں اقبال اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اقبال کا یہی احساسِ وجود ضمیر زبردست عبقری فکر کی بنیاد ہے۔ جب کسی شخص کو اپنے وجود کی قدر و قیمت کا ادراک ہو جاتا ہے تو اسکا قلب ایک شعلہ جوالہ میں خود بخود تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کا یہ بیش قیمت ادراک شعلہ جوالہ کی محافظت کی مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے۔ تحفظ ضمیر کے ضمن میں قرآن کی بھی زبردست تاکید ہے "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ" اس کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ مجددیوں فرماتے ہیں " محافظت کنید خویشتن را" حفظ وجود کا سب سے بہترین طریقہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے " تخلقوا باخلاق اللہ " یعنی اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرو ؎

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فشاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال کو بھی اسی شئے نایاب پر اصرار ہے کہ انسان کو قہاری و غفاری اور جبروت و قدوس کا مظہر عام بننا چاہیئے۔ تب کہیں جا کر اس وجود کی مکمل حفاظت ہو سکے گی ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

یہ کام اتنا آسان نہیں، جتنا شعری زبان کا جادو، اس کام کے براہیمی نظر کی طلب چاہیئے، کھٹوس تربیت کا ذریعہ چاہیئے اور مرضیٔ مولا کی نظر توفیق ملنی چاہیئے۔ اقبال اس اہم کام کے لئے دو نسخے تجویز کرتا ہے۔ ایک نسخہ بالفاظ حدیث پاک، "تخلقوا باخلاق اللہ" سے عبارت ہے۔ اقبال کے لفظوں میں مرضی مولا میں اپنی مرضی گم کرنا۔ تخلقوا باخلاق اللہ کے منصب پر فائز ہونا ہے لیکن یہ منصب صرف شہید کربلا

کے لئے مخصوص ہے اس کا راستہ نہایت سنگلاخ اور گنجلک ہے۔ جو ہر رو جاتا ہے ؎

در رضائش مرضی حق گم شود

ایں سخن کے باور مردم شود

مرضی مولا میں اپنی مرضی گم کرنا، اقبال کی عبقری فکر کی روح ہے، اسرار رموز میں جسکا تذکرہ قرآن کے حوالے سے بار بار کیا گیا ہے، اس باب میں اقبال نے جن جن احکامات کا بار بار اعادہ کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ واطیعواللہ وَاطیعوالرّسول ۔ ۲ ۔ من یطع الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہ ۔ ۳۔ اَطیعو اللّٰہ وَاطیعوا الرَّسُولَ ۔

۴۔ واطیعوا الرَّسول لَعَلَّکُم ترحمونَ

اقبال نے صاف طور پر واضح کر دیا ہے اگر تیرے ضمیر پر یزدوں کتاب وارد نہیں تو صاحب کشفاف ہوتے ہوئے بھی تو مرد آفاق نہیں ہو سکتا۔ روحِ دینِ مصطفوی تک اگر تیرے ضمیر کی رسائی نہ ہو سکی تو تیرا وجود نہ صرف دنیائے جمود کی مخلوق ہے بلکہ تو بولہبیت کا فرزند بھی ہے۔ دین مصطفوی ہی اقبال کے عبقری خیالات کا مرکز ہے، اس کے سوا سب "بولہبی ست" ہے ؎

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

دین مصطفوی سے شکوہ سنج ہونا یا اس کے قانون کی بالادستی سے انکار اقبال کے نزدیک انکار خودی کے مترادف ہے یہ انکار فرد کو حدود دینِ مصطفٰے سے بھی باہر کرتا ہے ؎

شکوہ سختیٔ آئین مشو

از حدود مصطفٰے بیروں مشو

اقبال کی عبقری فکر کی یہ منشاء ہے کہ منکر خدا اور منکر رسول کی وضاحت ہو جائے۔ جس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ باغی وہ شخص نہیں جو جمہور، بادشاہ، ریاست

یا پارلیمنٹ یا اس کے دستور کا باغی ہو بلکہ باغی وہ ہے جو حدود دین مصطفےٰ سے تجاوز کرتا ہو اور آیئن الٰہی کا منکر ہو ۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ

غرضکہ مصطفےٰ سے وفاداری ہی اقبال کے مطلوبہ انقلاب کا پہلا اور آخری نکتہ ہے ۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

قرآن فرماتا ہے "جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی دراصل ظالم ہیں "

ظالم سے جنگ اور مظلوم کی حمایت، خودی کا سب سے عظیم نصب العین ہے امن کا نفاذ اور سلامتی کی سربلندی خودی کی منزل ہے ۔ یہ کام عقل کے بس کا نہیں جنوں پسند قلندر عشق کا فقر یہ کام سرانجام دے سکتا ہے ۔

من بندۂ آزادم، عقل است غلام من
عقل است غلام من، عشق است امام من

شعریات اقبال میں عشق ایک نظام زندگی کے مرادف ہے جس کی تفصیل دم جبرئیل دل مصطفےٰ، کتاب اللہ اور رسولِ خدا میں مضمر ہے ۔ اقبال کی اردو شعریات عشق کے کلمات سے بھرا پڑا ہے ۔ عشق کی بدولت طبع مسلم قاہر و جابر ذات میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ اور عشق سے عاری شخص کافر اور زندیق کے مماثل ہو جاتا ہے ۔

طبع مسلم از محبت قاہر است
مسلم از عاشق نباشد کافر است

عشق کا مقام صرف ان کو میسر ہے جن کے حوصلے ہر لحظہ نئے طور اور نئی برق تجلی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں ۔

مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں • انھیں کا کام ہے یہ جنکے حوصلے ہیں زیاد

عشق دہ ہے جس کو سرتاپا دیکھا پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان کو عاشقی کے اس زندہ، سوزندہ اور تابندہ سبق کو جاننے، سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کیلئے اقبال مختلف تجاویز پیش کرتا ہے اور مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے۔ ایسا عشق جو ضمیر قالون میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کر سکے اور قلب بصیر کی لطافتوں سے حکومت وقت کی قاہر نگاہوں کو خیرہ کر دے، بغیر نگاہ نوح اور قلب ایوب کی چاہت کے ممکن نہیں ؎

عاشقی آموز و محبوبے طلب
چشم لوحے قلب ایوبے طلب

مزید برآں، اقبالؔ اس زوددار اور خود مختار انسان کو دوسرے انسان سے سوال کرنے کے لئے منع کرتا ہے، سوال اور گداگری، خودی کو ظلمت کدہ کی طرف مراجعت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ جمود و تعطل پیدا کرتی ہے۔ اور محتاج اور غلام زندگی بسر کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ خودی کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے اور بسیط خودی کو بے نور کر دیتی ہے ؎

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخل سینائے خودی

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بجا فرمایا "اونچا ہاتھ نیچے ہاتھ سے بہتر ہے"

"بے تجلی نخل سینائے خودی" کی صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے اقبال یہ تدبیر اختیار کرتا ہے کہ اگر انسان اس شترِ صحرا و بیاباں کے مثل کا مصداق بنے جو اپنے تزکیہ نفس اور وفاشعاری کے لئے دنیا میں مشہور ہے تو کام بن سکتا ہے، اپنی مدد آپ، خود نگر اور محنت شعار ہونے کے علاوہ صبر و استقلال کا پیکر بن کر ؎ "گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل" کا مظہر عام ہونا پڑیگا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

تب کہیں جاکر وہ اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کے منصب پر فائز ہو سکے گا اور دائرہ جبر سے بالاتر ہو کر مقام اختیار پر متمکن ہو سکے گا: کل کائنات کی غلامی کے طوق کو اتار کر آزاد بندوں میں اپنا نام درج کرا سکے گا اور تسخیر کائنات کے عظیم فرض سے سبکدوش ہو سکے گا ؎

در اطاعت کوش اے غفلت شکار
می شود از جبر پیدا اختیار

خدائے بزرگ کی اطاعت اور فرماں برداری سے ہی تجدید و احیاء کی تحریک کو زندگی ملتی ہے اور خودی صغیر کو اعجاز عمل کا تحفہ۔ اقبال کہتے ہیں ؎

زندگی بخشد ز عمل اعجاز عمل
می کند تجدید انداز عمل

اعجاز عمل اپنے مظاہر دکھلاتا ہے تو بندہ مومن کا ہاتھ۔ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے اور مشکل کشائی اور غالب آفرینی کے صدور کا مرکز عام ہو جاتا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب کار آفریں کارکشا کارساز

یا

کافر تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو آپ ہے تقدیر الٰہی

اطاعت کے نصب العین کو مضبوط پختہ اور شدید بنانے کے لیے ضبط نفس یا تزکیہ فرد کے موضوع کے تحت اقبال رموز کی گرہوں مزید کھولتا ہے اور باقاعدہ ضبط نفس کے عنوان سے ایک مخصوص باب مقرر کرتا ہے، اس باب میں توحید نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا بیان نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔ توحید سے اقبال کی کیا مراد ہے، زر، زن اور زمین جس میں وطن پرستی اور حکومت وقت کی بالادستی یا انسان پر انسان کی زبردستی بھی شامل ہے، پہلے آزادی۔ یہ آزادی جس میں جسمانی

ذہنی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی نیز مکمل نفس کی آزادی شامل ہے۔ سب سے منھ موڑ کر صرف اپنے رب سے لو لگاتی ہے۔ یہ آزادی شخص کو مقام اختیار پر فائز کرتی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایسا عصائے لاالہ پکڑاتی ہے جس کی مدد سے وہ ہر طلسم خوف کے باطل پہاڑ کو پاش پاش کرنے کی صلاحیت پا جاتا ہے ؎

تا عصائے لاالہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی بدست

اقبال اسی بے خوفی اور سرشاری کے ساتھ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی دعوت دیتا ہے۔ نماز انسان کو بلاشبہہ برائیوں سے روکتی ہے۔ روزہ انسان کے اندر تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ اور حج وطن پرستی کے جذبے پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ حج ہجرت الی اللہ، عالمگیر اخوت اور اجتماعیت کے عالمگیر پیغام سے بھی فرد کو آگاہ کرتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ایک طرف حرص و بلا کی پراگندہ خصلتوں کی تطہیر کرتی ہے تو دوسری طرف جماعت میں رنگ مساوات کی یکسانیت اور پختگی پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہ ارکانِ خودی کے بغیر عشق (اطاعت اللہ و اطاعت رسول) کے ممکن ہے۔ اور عشق کے لئے لازم ہے کہ وہ "الفقر فخری" کا نمونہ بنے۔ یہ الفقر فخری "حق صدِ حق" کی مثال ہے جو عشق کا عروج ہے اور مومن کی معراج ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

دراصل مومن از عشق است و عشق از مومن است ایک لازم و ملزوم حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسرار حیات کی گرہ کشائی میں اقبال نے اس عاشق جانباز سے دنیا کے تمام معبودوں سے انحراف کی تمنا ہے۔ اور وطن، سلطنت، حکومت، قوم، نسل، رنگ وغیرہ جیسے خداؤں سے منحرف ہو کر ایک خدائے واحد لاشریک کا یہ بندہ آزاد پجاری ہو جائے، یہی اقبال کی آرزو ہے۔ ظاہر ہے اقبال بندہ آزاد کو اس مقام پر لے جانا چاہتا ہے۔ جو قدسیوں کے قوت پرواز کے بس کا

کا نہیں ہے۔ اور اس مقام کی شان و آبرو۔ نام مصطفےٰ کے سوا کچھ نہیں ہے اور جس کا گھر دراصل دل مسلم ہے ؎

در دل مسلم مقام مصطفےٰ است
آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است

نام مصطفےٰ کو دل میں گھر کرنے والا کوئی معمولی انسان نہیں، مرد کامل اور نائب حق ہے۔ اور اس کی ہستی "اسم اعظم" کا پرتو ہے اور وہ عالم تکوین کی روح ہے ؎

نائب حق ہمچوں جان عالم است
ہستی او ظل اسم اعظم است

قرآن سے فکر اقبال کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۔ اِنّی جاعل فی الارض خلیفہ
۲۔ خلیفۃ فی السمٰوات وما فی الارض

بے شک! مرد مومن کی ذات ہی تمام عالم کی توجیہ کا ذریعہ ہے اور اسی کی ذات جمیل و جلیل سے عالم کی نجات ممکن ہے ؎

ذات او توجیہہ ذات عالم است
از جلال او نجات عالم است

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسماں و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

مرد مومن کے اِن اختیارات جلیلہ پر روشنی ڈالنے کے بعد اقبال اس کے فرائض منصبی کی طرف بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اگرچہ مرد مومن کے عالم بشریت کی زد میں گردوں ہے اور بقول حضرت سید محدث کچھوچھوی ؎

خودی میں سارا سمٹ آیا ہے عالم تکوین
میری سرشت میں مضمر ہے راز کن و فیکون

تو یہ بھی لازم قرار پاتا کہ مرد مومن زمین اور آسمانوں کی فکر میں ہر لحظہ نئی شان۔

نے وقار کے ساتھ فعال اور بیتاب رہے۔

۱۔ وہ نیکی کی طرف بلائے اور برائیوں سے تمام آفاق کو روکے۔

۲۔ دنیا کو امن و عدل اور آزادی سے معمور کردے۔

۳۔ سراپا عشق و رحمت کا بادل بن کر دنیا پر برسے اور اپنی شفقت کے بدلے دنیا کو مول لے ؎

فطرت مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است

۴۔ ہر نوع کی غربت و افلاس سے دنیا کو نجات دلادے اور غربت و افلاس کے خاتمہ کے لئے جہاد کرے۔

۵۔ مکمل آفاق کو نور کدۂ مصطفیٰ میں تبدیل کردے۔ اور "سارا جہاں ہمارا" کا نعرۂ عالمگیر بلند کرے۔

اسرار حیات کے یہ نکات رموز بیخودی کے مطالعہ کے بعد بآسانی منکشف ہو جاتے ہیں اور یہیں سے اقبال کے اجتماعی تشکیلات کے نظریات کا آغاز ہوتا ہے۔ رموز کا مطالعہ اس امر پر شاہد ہے کہ مرد مومن کے تجدید عمل سے ہی جماعت کی تشکیل ممکن ہے عمل کے وجود سے ہی خود بخود جماعت کا ظہور عالم امکاں میں جلوہ ساماں ہوتا ہے اور ایک فطری جماعت وجود میں آجاتی ہے۔ اقبال کا یقین ہے کہ یہ فعال شعلہ آگیں افراد پر مشتمل آفاقی فطری جماعت ہوتی ہے۔ اس نمونہ جماعت کا عبقری تصور پانچ اجزائے ترکیبی کے امتزاج سے تشکیل ہے، ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ اس جماعت کا ایک فرد جو مرد کامل ہے، نٹشے کے فوق البشر کی طرح نہیں جو بغیر جماعت کے خود کو دنیا کا خلیفہ بتلاتا ہے اور دنیا کی تسخیر کا متلاشی ہے بے شک فرد کا کمال ملت بیضا میں ہی مضمر ہے ؎

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملت است

۲۔ جماعت کی تشکیل سے مرد مومن کی ذات و شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے دراصل فرد واحد اکیلا محض ایک بوند پانی کے مانند بے مایہ ہے لیکن جب کسی سمندر بیتاب سے ہمکنار ہوتا ہے تو خود بھی بحر زخار سے موسوم ہوتا ہے ؎

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرہ وسعت طلب قلزم شود

۳۔ فرد تنہا مدعائے زندگی سے غافل رہ سکتا ہے، دوسرے یہ بھی کہ جماعت سے فرد کی قوت میں ایک جماعت کی قوت سمٹ آتی ہے ؎

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

۴۔ یہ ایک واضح کلیہ ہے کہ کسی نظام کو برپا کرنے کے ایک منظم جماعت کا ہونا لازمی ہے ؎

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

۵۔ جماعت کی تشکیل منشائے الٰہی اور پیروی رسول کے مطابق ہے ؎

حرز جاں کن گفتہ خیر البشرؐ
ہست شیطاں از جماعت دور تر

اقبال کے نظریات کی تصدیق احادیث نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ

(۱) "اے مسلمانوں! تم پر اجتماعی زندگی فرض کی گئی، جو شخص جماعت سے الگ ہو گیا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔"
(۲) "جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔"

۲- "جماعت سے الگ مت رہو کیوں کہ بھیڑیا اسی بکری کو لیجاتا ہے جو گلہ سے الگ ہو جاتی ہے۔"

اس جماعت سوزندہ کے تشکیل کے بعد، اقبال اپنے اساسی نقطہ نظر یعنی توحید کی وضاحت دو ٹوک انداز یوں کرتا ہے ؎

ملت بیضا تن و جان لا الہ

ساز ما را پردہ گردان لا الہ

لا الہ سرمایہ اسرار ما   رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

"ملت بیضا تن و جان لا الہ" کی تشریح یہاں ممکن نہیں لیکن اجمالاً تحریر ہے کہ مرد مومن سے تشکیل پائی ہوئی جماعت عجیب سادہ و رنگین ہوتی ہے، اس جماعت کے گھرانے، روحیں، افکار، جذبات، جانیں، اموال، نیندیں اور خوشیاں اور تمام اسباب اور ضروریات خودی اور صرف خدائے واحد کے لئے ہوتی ہیں۔ وطن، ملک، حکومت جمہوریہ سلطنت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا ہے فکر و عمل کا انقلاب

بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

رسول عربیؐ نے بھی آگاہ فرمایا کہ "میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں، کوئی الہ نہیں ہے بجز اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے۔ جو رب ہے آسمانوں اور زمینوں کا اور ہر چیز کا جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے" اقبال کا خیال ہے کہ ؎

نوع انساں را پیام آخریں

حامل او رحمۃ اللعالمیں

خدا کے قانون کی بالادستی اور نظام مصطفےٰ کا نفاذ، یہی تشکیل جماعت کی اصل منشاء ہے۔ ظاہر ہے کہ اس منشاء کی تکمیل میں سخت ایذائیں،

خوف و ہراس اور زبردست اذیتیں آڑے آسکتی ہے، زندگیاں تلخ و تنگ کی جاسکتی ہیں کارکنان خودی مطلق پر ظلموں کے پہاڑ توڑے جاسکتے ہیں اور صحیفہ پاسبان خودی کے عزم مصمم کی راہ عزیمت میں طاغوتی جعل بچھایا جاسکتا ہے۔ اس مرحلہ پر اقبال آئین قرآن کو معیار بنا کر بے خوف لکھتا ہے کہ۔ خدا کے ہو جاؤ، زمانہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گے۔ اور قرآن کے چار اصولوں کا بیان کرتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مرد کامل کو چاہیئے کہ وہ مقاصد عالیہ نیز زندگی کے تمام بزرگ پہلوؤں کو لا تقنطو" سے محکم کرلے اور مایوسی کو کفر جانے ؎

مرگ را سامان ز قطع آرزوست
زندگانی محکم از لاتقنطوا

قرآن فرماتا ہے "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ" یعنی تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

۲۔ اسی طرح تمام یاس و حزن اور کرب و ستم کو "لاتحزن" کی بلیغ تعلیم سے دور کیا جاسکتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا" لا تحزن ان اللہ معنا" یعنی تم کچھ غم نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اقبال کا اس آیت کریمہ پر ایمان ہے۔ اس کی روشنی میں وہ لکھتا ہے ؎

اے کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لا تحزن بگیر

۳۔ دراصل ایمان و یقین سے سرشار حیات کا مالک کسی نوع کے خوف و ہراس یا ملال کا شکار نہیں ہوتی کیوں کہ اس کا سب سے بڑا ہتھیار لاخوف علیھم" اس کے پاس ہے ؎

قوت ایماں حیات افزایدت
ورد لاخوف علیھم بایدت

قرآن میں ہے "وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" یعنی نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی حزن وملال۔

۴۔ اقبال خوشامد پرستی، عیاری، کینہ پروری، دروغ گوئی اور ضمیر فروشی جیسی تمام بیماریوں کی اصل خوف کو ہی قرار دیتا ہے۔ لوگ کام کے پورا نہ ہونے کے سبب اپنی شریعت ضمیر کا سودا کرتے ہیں۔ اسی لئے اقبال خوف کو شرک قرار دیتا ہے۔ اس کا مردِ مومن ہم صلح وہم پیکار ہے لیکن کسی سے خوف نہیں کھاتا ؎

ہر کہ رمز مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اقبال کے خیالات کا لب لباب منشائے قرآن میں مضمر ہے۔ قرآن کی فکر دیدنی ہے "دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مومن ہو۔" اپنے اردو کلام میں اقبالؔ کہتے ہیں ؎

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پر حجت ہے نکتہ لولاک

توحید سے متعلق اقبال کے عبقری افکار کے بعد ظاہر ہے کہ رسالت کے موضوع پر رموزِ بیخودی میں خاصا مواد ہونا چاہئے۔ اور اقبال کے لئے نام مصطفےٰ ہی اس کی آبروئے حیات کی غمازی کرتی ہے لہٰذا جہاں تکوین کی قیادت کے سوال پر اقبال نے رسالت پر تفصیلی گفتگو کی ہے ؎

از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما

اس طرح اقبال نے دنیا کے تمام لیڈروں مفکروں، حاکموں اور قائدوں کو باطل قرار دے کر رسول عربی کو حقیقی قائد تسلیم کر لیا اور بتایا کہ رسول عربی آخری رسول ہیں ان کی ذات اولیٰ پر دین مکمل ہوا۔

بس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد

اقبال شریعت مصطفوی کے سوا ہر نظام سے مرد مومن کو بیگانہ کر دینا چاہتا ہے اور "چراغ مصطفےٰ" کا پروانہ بننے کی تاکید کرتا ہے ؎

امتے از ما سوا بیگانۂ
بر چراغ مصطفیٰ پروانۂ

قرآن بھی تاکید فرماتا ہے۔ "یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنائے۔"[1]

اس تاکیدی فرمان کے بعد جب رموز میں اقبال نظام مصطفےٰ کی غرض و غایت کا مطالعہ کرتا ہے تو تین نکات واضح طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

(۱) حریت (۲) اخوت (۳) مساوات۔

اخوت، حریت اور مساوات کا بیان دو اشعار میں سمیٹ کر اقبال نے واقعی کوزے میں سمندر بند کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

کلّ مومن اخوۃ اندر دلش — حریت سرمایہ آب و گلش
تا شکیب امتیازات آمدہ — در نہاد او مساوات آمدہ

نظام مصطفےٰ میں اقبال کے خیال کے مطابق انسان کو آزادی ضمیر، آزادی علم، آزادی فکر، آزادی عمل، آزادی مذہب، آزادی معاش اور آزادی کلام کی پوری سہولتیں میسر ہوں گی۔ اس آزادی کا لازمی نتیجہ اخوت اور مساوات کا رنگ پیدا ہونا ہوگا۔ مساوات کا تو یہ عالم ہے کہ قرآن کا فرمان ہے کہ "ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم" یعنی اللہ کے نزدیک تم لوگوں میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔" اس ضمن میں اقبال نے حضرت بلال کی نمونہ زندگی پیش کی ہے نیز ترکستان کے سلطان کا واقعہ بھی نقل کیا ہے۔ مساوات کے ضمن میں اقبال نے قصاص اور احسان کا وہی قرآنی نظریہ پیش کیا ہے جو قرآن کے مطابق،

"اے عقل والوں، اگر تم غور کرو گے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ قصاص کے قانون

---

[1] حدیث نبوی ہے انما المومنون اخوۃ "یعنی مسلمان آپس میں بھائی، بھائی ہیں۔

ہیں تمہارے لئے زندگی کا راز مخفی ہے۔ سے عبارت ہے۔ اسی آیۃ قرآن کی روشنی میں اخوت اور مساوات کے وہ اصول اقبال نے مرتب کرتا ہے، جس کی بدولت بوریا نشینوں نے مسند نشینوں پر حکومت کی ہے ؎

پیش قرآن بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسند و دیبا یکے است

حریت کے غائر مطالعہ کے تناظر میں اقبال امام حسین کا والہانہ ذکر کرتا ہے جو بیان حریت کی جیتی جاگتی جاوداں مثال ہیں ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل

حریت کی یہ تفصیل "سر دین ابراہیم" کی تفصیلات بتاتی ہیں ؎

سر ابراھیم و اسمٰعیل بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود

حسین کے جد امجد ابراہیم و اسمٰعیل ہیں۔ ان کو مرد آزاد اور جانباز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انھوں نے آزادی ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر جان کی بازی لگا دی اور انھوں نے اپنے خون سے اسلام کی تفسیر لکھی۔ انھوں نے ملت بیضا کی تجدید کی، باطل کو پسپا کر دیا اور چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی کو خاکستر کر دیا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اس طرح اقبال اپنے توحید و رسالت کا ماخذ قرآن اور حدیث قرار دیتا ہے اور اپنے کلام کی منشا واضح کرتا ہے کہ عالم رنگ و بو کی انتہا توحید کا غلبہ ہے، شریعت الٰہی کی بالادستی ہے اور اس قانون کے علاوہ سب ادیان باطل ہیں۔ آئین حیات صرف دین مصطفوی ہے اور اسی میں سب کی فلاح ہے۔ اشعار اقبال دیدنی ہیں۔ ؎

نقطہ ادوار عالم لاالہ انتہائے کار عالم لاالہ

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

ہست دین مصطفٰے دین حیات شرح او تفسیر آئین حیات

جب فرد اس دین محکم کی رکنیت تسلیم کر لیتا ہے اور اس کی منشاء میں اپنی منشاء گم کر دیتا ہے تو جاوداں زندگی اس کا مقدر بنتی ہے اور تسخیر کائنات اس کی تقدیر ؎

جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن

کلام اردو بھی دیکھتے جائیے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کہ یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

یا

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

عالم تکوین اس کا وطن ہے۔ دراصل اقبال تو تسخیر یزداں کا قائل ہے اور وہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو بحیثیت شہید کبریا کے دیکھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے وطن کی کیا حقیقت ہے ؎

در دشت جنوں من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال وطن کو تازہ ترین خدا اور دین کا قاتل قرار دیتا ہے۔ مردم آفاق کے لئے پوری دنیا اس کا وطن ہے۔ یہی اقبال کے نظریۂ وطن کی اصل روح ہے ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاق

اقبال نے اس ضمن کوئی مصلحت یا تاویل کی گنجائش نہیں چھوڑتا بلکہ ظالم حکومت کے خلاف برسرپیکار رہنے یا وہاں سے ہجرت کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور محترک جماعت کو جمود سے بچاتا ہے ؎

ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است

وطن زندگی کی آزادانہ روش کو بھی مجروح کرتا ہے جب کہ زندگی قید حیات سے ہونا چاہتی ہے اور فلک الافلاک کی سیر کی خواہاں ہے ؎

ہر کہ از قید جہات آزاد شد
چوں فلک در خویش جہت آباد شد

اقبال کہتے ہیں کہ مغربی قومیں مشرق اور ایشیا کو عدل و مساوات کا حق دینا نہیں چاہتیں اور ہمیشہ انھیں کمزور دیکھنا چاہتی ہیں، اسی لئے جب وہ مجبوراً دنیا کو متحد کرنے اکٹھے بھی ہیں تو وحدتِ انسانیت کے نام نہیں بلکہ وحدت اقوام کے نام پر۔

یہ طریقہ انھوں نے اس مقصد سے اپنایا ہے کہ قوموں کے اندر احساس قومیت بیدار رہے اور وہ باہمی رقابت و عداوت کا کھیل کھیلتی رہیں اور اس طرح بڑی قوموں کو مداخلت اور ثالثی کا موقع ملتا رہے "مکہ اور جنیوا" کے عنوان سے انھوں نے لکھا تھا ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم!
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

جاوید نامہ میں نظریہ قومیت پر تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

لرد مغرب آں سراپا مکر و فن — اہل دیں را داد تعلیم وطن
او بفکر مرکز و تو در نفاق — بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیز خوب و زشت — دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت
چیست دیں برخاستن از روئے خاک — تا ز خود آگاہ گردد جان پاک
گرچہ آدم بردمید از آب و گل — رنگ و نم چوں گل کشید از آب و گل
حیف اگر در آب و گل غلطد مدام — حیف اگر برتر نہ پرد زیں مقام
گفت تن در شو بخاک رہ گذر — گفت جاں پہنائے عالم را نگر
جاں نگنجد در جہات اے ہوشمند — مرد حر بیگانہ از ہر قید و بند

حر ز خاک تیرہ آید در خروش
زانکہ از بازاں نیاید کار موش

انھوں نے آل انڈیا ریڈیو (لاہور) کی استدعا پر یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو سال نو کے موقع پر اپنے پیغام میں دنیا کو انسان دوستی کی طرف بلایا اور قومیت کی ہلاکت خیزیاں یاد دلائیں:۔

"آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں، اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے، لیکن اس تمام ترقی کے باوجود استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔

ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال نہیں پیش کرسکتا......

وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے، جب تک اس نام نہاد جمہوریت اس ناپاک قوم پرستی اور اس کی ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان

اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے، اور اخوت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔"

خطبۂ صدارت مسلم کانفرنس منعقدۂ لاہور ۱۹۳۲ء میں فرمایا تھا:۔

"میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم کا مخالف ہوں اس لئے کہ مجھے اس تحریک میں مادیت اور الحاد کے جراثیم نظر آ رہے ہیں، اور یہ جراثیم میرے نزدیک دورِ حاضر کی انسانیت کے لئے شدید ترین خطرات کا سرچشمہ ہے۔

اگرچہ حب وطن ایک فطری امر ہے، اور اس لئے اخلاقی زندگی کا ایک جزو ہے لیکن جو شئے سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ انسان کا مذہب ہے، اس کا کلچر اس کی ملی روایات ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لئے انسانوں کو زندہ رہنا چاہیئے، اور جن کی خاطر انھیں اپنی جان قربان کرنی چاہیئے، وہ خطۂ زمین جس میں وہ رہتا ہے، اور جس کے ساتھ عارضی طور پر اس کی روح وابستہ ہوتی ہے، اس لائق نہیں کہ اسے خدا اور مذہب سے برتر قرار دیا جائے۔"

اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے مارچ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے ایک مضمون میں لکھا تھا:۔

"قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں، ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں، جو ہند کے نام سے موسوم ہے، علیٰ ہذا القیاس، چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔

وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے، اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا، ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے، اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے، مگر زمانہ حال

کے سیاسی لٹریچر میں ـــــ وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک تصور ہے، چونکہ اسلام بھی ایک اجتماعیہ انسانیہ کا قانون ہے۔ اس لئے جب لفظ "وطن" کو ایک تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔"

اقبال کے عبقری خیالات یہاں آکر ختم نہیں ہوئے بلکہ وہ یہاں پہونچ کر "حیات نصف" سے مخاطب ہوتا ہے جو دراصل ملت بیضا کی ماں ہیں۔ وجود زن ہی تصویر کائنات میں رنگ و روغن کی نمود ہوتی ہے اور اسی کے شعلہ دروں سے شرار افلاطون افشاں ہوتا ہے ـــ

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

اور یہ اسی کے کرشمہ بطن کا ظہور ہے جو بصورت اسماعیل و حسین مرد آفاق شہید کبریا کے مرتبہ پر فائز ہے ـــ

وہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھایا کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

حاصل کلام یہ ہے کہ جس طرح کسی مرد آفاق کے لئے اسوۂ محمد مثال ہے اسی طرح زن آفاق کے لئے اسوۂ فاطمہ الزہرا ایک آئینہ ہے ـــ

مزرع تسلیم را حاصل بتول
مادران را اسوہ کامل بتول
تا حسینے شاخ توبار آورد
موسم پیش بہ گلزار آورد

فاطمہ زہرا ایسے بیٹے کی ماں بننے کا شرف رکھتی ہیں، جو کائنات کے لئے کیلئے ایک مثال ہے وہ ایک مرد خود آگاہ خدا مست، قرآن نما حسین کی ماں ہیں۔ تمام زن عصر کو سوچنا چاہئے کہ کیا نغمہ حسین کے سوا بھی نوائے زندگی میں سوز و

سازکے کا اور کوئی ذریعہ ہے اور اگر نہیں ہے تو ان کو حیات حسین سے سبق حاصل کر کے بقول جنت کی تقلید کرنی چاہیئے ؎

در نوائے زندگی سوز از حسین
اہل حق حریت آموز از حسین

عورت کی سرشت میں رحمت داخل ہے۔ اس تناظر میں ان کو نبوت سے خاص لگاؤ ہونا چاہیئے کیوں کہ رسول اکرم صلے علیہ وسلم رحمتہ للعالمین ہیں لفظ ام سے نہ صرف امت مشتق ہے بلکہ امومت کی شفقت و رحمت سے ہی اقوام اور ان کے کردار و افکار کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس لئے اقبال نے اس عظیم و احسن منصب کو مرتبہ پیغمبری سے نسبت دی ہے ؎

شفقت او از شفقت پیغمبر است
سیرت اقوام را صورت گر است

در اصل امومت ہی تسلسل حیات اور کشف اسرار حیات کا مخزن ہے۔ اگر وہ اپنے اس فرض سے تغافل برتے تو زندگی میں تعطل پیدا ہو جائے۔ اس لحاظ سے امومت مشیئت ایزدی میں معاون و مددگار ہے اور اس کی لطیف نگاہوں میں "اثر کن فیکون مضمر ہے اور اس کی حیات کاملہ" از امومت گرم رفتار حیات" نیز "از امومت کشف اسرار حیات" کی مصداق ہے۔

اقبال نے امومت کو، "حافظ رمز اخوت" اور قوت قرآن و ملت" سے بھی یاد کیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ اگر غیر اللہ کو سجدہ حرام نہ ہوتا تو وہ امومت کا سجدہ کرتا۔ بیشک امومت ہی مرد لولاک کی بھی ماں ہے۔

اقبال کے اسرار و رموز کا اجمال موج نفس کی تلوار کی اس دھار میں مضمر ہے جس کا جوہر لا الہ الا اللہ ہے اور آب محمد رسول اللہ ؎

کہ محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے

(مقدس)

عموماً لفظ جہاد کا ترجمہ انگریزی زبان میں "مقدس جنگ" کیا جاتا ہے اور اس کی تشریح و تفسیر مدت ہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ "جوشِ جنوں" کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے داڑھیاں چڑھائے، خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آرہا ہے جہاں کسی کافر کو پاتا ہے پکڑ لیتا ہے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول لا الٰہ الا اللہ ورنہ ابھی سر تن سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ ماہرین نے یہ ہماری یہ تصویر بڑی قلم کاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حرفوں میں لکھ دیا ہے۔

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

اس کے بعد لطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود کئی صدیوں سے انتہا درجہ کی غیر مقدس جنگ میں مشغول ہیں۔

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال　　غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

ان کی اپنی تصویر یہ ہے کہ وہ دولت و اقتدار کے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر قزاقوں کی طرح ساری دنیا پر پل پڑتے ہیں اور ہر طرف تجارت کی منڈیاں، خام پیداوار کے ذخیرے نو آبادیاں بنانے کے قابل زمینیں اور معدنیات کی کانیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ اپنے نفس کی کبھی نہ بجھنے والی آگ کے لئے ایندھن فراہم کریں۔ ان کی جنگ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ پیٹ کی راہ میں ہے ہوس اور نفس امّارہ کی راہ میں ہے۔ ان کے نزدیک کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے بس یہ کافی وجہ جواز ہے کہ اس کی زمین میں کانیں ہیں یا اجناس کافی پیدا ہوتی ہیں۔ یا ان کے کارخانوں کا مال اچھی طرح وہاں کھپایا جاسکتا ہے یا اپنی زائد آبادی کو وہاں آسانی کے ساتھ بسایا جاسکتا ہے یا اور کچھ نہیں تو اس قوم کا یہ گناہ بھی کوئی معمولی گناہ نہیں کہ وہ کسی ایسے ملک کے راستے میں رہتی ہے جس پر یہ پہلے قبضہ کر چکے ہیں یا اب قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے تو جو کچھ کیا وہ زمانۂ ماضی کا قصہ ہے اور ان کے کارنامے حال کے واقعات ہیں جو شب و روز دنیا کی آنکھوں کے سامنے گذر رہے ہیں۔ الشیار افریقہ، یورپ، امریکہ غرض کرۂ زمین کا کون سا حصہ ایسا بچا رہ گیا ہے جو ان کی غیر مقدس جنگ سے لالہ زار نہیں ہو چکا ہے؟ مگر ان کی مہارت قابل داد ہے۔ انھوں نے ہماری تصویر اتنی بڑی بنائی کہ خود ان کی تصویر اس کے پیچھے چھپ گئی۔ اور ہماری سادہ لوحی بھی قابل داد ہے۔ جب ہم نے غیروں کی بنائی ہوئی اپنی یہ تصویر دیکھی تو ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ ہمیں اس تصویر کے پیچھے جھانک کر خود مصوروں کی صورت دیکھنے کا ہوش ہی نہ آیا اور لگے معذرت کرنے کہ حضور! بھلا ہم جنگ و قتال کیا جانیں، ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پُر امن مبلغ لوگ ہیں، چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان کی جگہ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرا لینا، بس یہ ہمارا کام ہے۔ ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا حضور کبھی کبھار ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب ہمیں کوئی مارنے آیا تو ہم نے جواب میں ہاتھ اٹھا دیا سو اب تو ہم اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں۔ حضور

کے طمانیت کے لئے "تلوار والے جہاد کو" سرکاری طور پر" منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اب تو لفظ جہاد زبان و قلم کی کوشش کا نام ہے۔ توپ اور بندوق چلانا سرکار کا کام ہے اور زبان و قلم چلانا ہمارا کام۔

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
باطل کی فال و فر کی حفاظت کے واسطے — یورپ رزہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے — مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات — اسلام کا محاسبہ، یورپ سے در گذر

خیر یہ تو سیاسی چالوں کی بات ہے۔ مگر خالص علمی حیثیت سے جب ہم ان اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے "جہاد فی سبیل اللہ" کی حقیقت کو سمجھنا غیر مسلموں اور خود مسلمانوں کے لئے دشوار ہو گیا ہے تو ہمیں دو بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے۔

پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کو ان معنوں میں محض ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں لفظ مذہب عموماً بولا جاتا ہے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان معنوں میں محض ایک قوم سمجھ لیا گیا جن میں یہ لفظ عموماً مستعمل ہوتا ہے۔

ان دو غلط فہمیوں نے صرف ایک جہاد ہی کے مسئلے کو نہیں، بلکہ مجموعی حیثیت سے پورے اسلام کے نقشے کو بدل ڈالا ہے اور مسلمانوں کی پوزیشن کلی طور پر غلط کر کے رکھ دی ہے۔

مذہب کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ چند عقائد اور چند عبادات اور مراسم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مذہب کو واقعی ایک پرائیوٹ معاملہ ہی ہونا چاہیئے۔ آپ کو اختیار ہے جو عقیدہ چاہیں رکھیں اور آپ کا ضمیر جس کی عبادت کرنے پر راضی ہو اس کو جس طرح چاہیں پکاریں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جوش اور سرگرمی آپ کے اندر اس مذہب کیلئے

موجود ہے تو آپ دنیا بھر میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے ہوئے اور دوسرے عقائد والوں سے مناظرے کیجئے۔ اس کے لئے تلوار ہاتھ میں پکڑنے کا کونسا موقع ہے؟ کیا آپ لوگوں کو مار مار کر اپنا ہم عقیدہ بنانا چاہتے ہیں؟ یہ سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ آپ اسلام کو عام اصطلاح کی رو سے ایک "مذہب" قرار دے لیں، اور یہ پوزیشن اگر واقعی اسلام کی ہو تو جہاد کے لئے حقیقت میں کوئی وجہ جواز ثابت نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح "قوم" کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ وہ ایک متجانس گروہ اشخاص (HOMOGENEOUS GROUP OF MAN) کا نام ہے جو چند بنیادی امور میں مشترک ہونے کی وجہ سے باہم مجتمع اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو گیا ہو، اس معنی میں جو گروہ ایک قوم ہو وہ دو ہی وجوہ سے تلوار اٹھاتا ہے اور اٹھا سکتا ہے یا تو اس کے جائز حقوق چھیننے کیلئے کوئی اس پر حملہ کرے، یا وہ خود دوسروں کے جائز حقوق چھیننے کے لئے حملہ آور ہو۔ پہلی صورت میں تو خیر تلوار اٹھانے کے لئے کچھ نہ کچھ اخلاقی جواز موجود بھی ہے (اگرچہ بعض دھرماتماؤں کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہے) لیکن دوسری صورت کو تو بعض ڈکٹیٹروں کے سوا کوئی بھی جائز نہیں کہہ سکتا، حتیٰ کہ برطانیہ اور فرانس جیسی وسیع سلطنتوں کے مدبرین بھی اسکو جائز کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟

یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج

آلِ سیزر چوب نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

مسولینی (اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)

پس اگر اسلام ایک "مذہب" اور مسلمان ایک قوم" ہے تو جہاد کی ساری معنویت جس کی بنا پر اسے افضل العبادات کہا گیا ہے، سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کسی "مذہب" اور مسلمان کسی "قوم" کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم SOCIAL ORDER کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا ہے اور مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت INTERNATIONAL REVOLUTIONARY PARTY کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے منظم کرتا ہے اور جہاد اس انقلابی جد وجہد REVOLUTIONARY STRUGGLE کا اس انتہائی صرف طاقت کا نام ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے۔

شعلہ بنکے پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

تمام انقلابی مسلکوں کی طرح اسلام بھی عام مروج الفاظ کو چھوڑ کر اپنی ایک خاص اصطلاحی زبان TERMONOLOGY اختیار کرتا ہے تاکہ اس کے انقلابی تصورات عام تصورات سے ممتاز ہو سکیں۔ لفظ جہاد بھی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے اسلام نے حرب اور اسی نوعیت کے دوسرے عربی الفاظ جو جنگ WAR کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں، قصداً ترک کر دیئے اور ان کی جگہ "جہاد" کا لفظ استعمال کیا جو STRUGGLE کا ہم معنی ہے۔ انگریزی میں اسکا صحیح مفہوم جو یوں ادا کیا جا سکتا ہے:

"TO EXERT ONE'S UTMOST ENDEAVOUR IN PURSUIT OF A CAUSE."

اپنی تمام طاقتیں کسی مقصد کی تحصیل میں صرف کر دینا"

سوال یہ ہے کہ پرانے الفاظ کو چھوڑ کر یہ نیا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ "جنگ" کا لفظ قوموں اور سلطنتوں کی ان لڑائیوں کیلئے استعمال ہوتا تھا اور آج تک ہو رہا ہے۔ جو اشخاص یا جماعتوں کی نفسانی اغراض کیلئے کی جاتی ہیں۔ ان لڑائیوں کے مقاصد محض ایسی شخصی یا اجتماعی مقاصد ہوتے ہیں جنکے

اندر کسی نظریہ اور کسی اصول کی حمایت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسلام کی لڑائی چوں کہ اس نوعیت کی نہیں ہے اس لئے وہ سرے سے اس لفظ ہی کو ترک کر دیتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ایک قوم کا مفاد یا دوسری قوم کا نقصان نہیں ہے۔ وہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ زمین پر ایک سلطنت کا قبضہ رہے یا دوسری سلطنت کا۔ اس کو دلچسپی جس چیز سے ہے وہ محض انسانیت کی فلاح ہے۔

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

اسی فلاح کے لئے وہ اپنا ایک خاص نظریہ اور ایک عملی مسلک رکھتا ہے اس نظریہ اور مسلک کے خلاف جہاں جس چیز کی حکومت بھی ہے۔ اسلام اس کو مٹانا چاہتا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی ملک ہو۔ اس کا مدعا اپنے نظریہ اور مسلک کی حکومت قائم کرنا ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ کون اس کا جھنڈا لے کر اٹھتا ہے اور کس کی حکمرانی پر اس کی ضرب پڑتی ہے۔ وہ زمین مانگتا ہے ـــــ زمین کا ایک حصہ نہیں بلکہ پورا کرۂ زمین ـــــ اس لئے نہیں کہ ایک قوم یا بہت سی قوموں کے ہاتھ سے نکل کر زمین کی حکومت کسی خاص قوم کے ہاتھ میں آجائے بلکہ صرف اس لئے کہ انسانیت کی فلاح کا جو نظریہ اور پروگرام اس کے پاس ہے اس سے تمام نوعِ انسانی متمتع ہو۔ اس غرض کے لئے وہ تمام طاقتوں سے کام لینا چاہتا ہے جو انقلاب برپا کرنے کے لئے کارگر ہو سکتی ہے اور ان سب طاقتوں کے استعمال کا ایک جامع نام "جہاد" رکھتا ہے۔ زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطۂ نظر کو بدلنا اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے۔ تلوار کے زور سے پرانے ظالمانہ نظامِ زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے۔ اور اس راہ میں مال صرف کرنا اور جسم سے دوڑ دھوپ کرنا بھی جہاد ہے۔

لیکن اسلام کا جہاد نرا "جہاد" نہیں ہے بلکہ "جہاد فی سبیل اللہ" ہے اور فی سبیل اللہ کی قید اس کے ساتھ ایک لازمی قید ہے۔ یہ "فی سبیل اللہ" کا لفظ

بھی اسلام کی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس طرف ابھی میں اشارہ کرچکا ہوں اس کا لفظی ترجمہ ہے "راہ خدا میں" اس ترجمہ سے لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ زبردستی لوگوں کو اسلام کے مذہبی عقائد کا پیرو بنانا جہاد فی سبیل اللہ ہے کیوں کہ لوگوں کے تنگ دماغوں میں "راہ خدا" کا کوئی مفہوم اس کے سوا نہیں سما سکتا، مگر اسلام کی زبان میں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ہر وہ کام جو اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے کیا جائے اور جس کے کرنے والے کا مقصد اس سے خود کوئی دنیوی فائدہ اٹھانا نہ ہو۔ بلکہ محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو، اسلام ایسے کام کو "فی سبیل اللہ" قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ خیرات دیتے ہیں، اس نیت سے کہ اس دنیا میں مادی یا اخلاقی طور پر اس خیرات کا کوئی فائدہ پلٹ کر آپ کی طرف آئے تو یہ فی سبیل اللہ نہیں ہے اور اگر خیرات سے آپ کی نیت یہ ہے کہ ایک غریب انسان کی مدد کر کے آپ خدا کی خوشنودی حاصل کریں تو یہ فی سبیل اللہ ہے۔ بس یہ اصطلاح مخصوص ہے ایسے نیک کاموں کے لئے جو کامل خلوص کے ساتھ ہر قسم کی نفسانی اغراض سے پاک ہو کر اس نظریہ پر کئے جائیں کہ انسان کا دوسرے انسانوں کی فلاح کے لئے کام کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے اور انسان کی زندگی کا نصب العین مالک کائنات کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

"جہاد" کے لئے بھی "فی سبیل اللہ" کی قید اسی غرض کے لئے لگائی گئی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جب نظام حکومت میں انقلاب برپا کرنے اور اسلامی نظریہ کے مطابق نیا نظام مرتب کرنے کے لئے جد وجہد کرنے اٹھے، تو اس قیام اور اس سربازی و جاں نثاری میں اس کی اپنی کوئی نفسانی غرض نہ ہونی چاہئے۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ قیصر کو ہٹا کر خود قیصر بن جائے۔ اپنی ذات کے لئے مال و دولت یا شہرت و ناموری یا عزت و جاہ حاصل کرنے کا شائبہ تک اس کی جد وجہد کے مقاصد میں شامل نہ ہونا چاہئے

مقام فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

اس کی تمام قربانیوں اور ساری محنتوں کا مدعا صرف یہ ہونا چاہیے کہ بندگان خدا کے درمیان ایک عادلانہ نظام زندگی قائم کیا جائے، اور اس معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا اور کچھ مطلوب نہ ہو۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

قرآن کہتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ۔

"ایمان دار! خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں"

طاغوت کا مصدر طغیان ہے جس کے معنی حد سے گذر جانے کے ہیں۔ دریا جب اپنی حد سے گذر جاتا ہے تو آپ کہتے ہیں طغیانی آگئی ہے۔ اسی طرح جب آدمی اپنی جائز حد سے گذر کر اس غرض کے لئے اپنی طاقت استعمال کرتا ہے کہ انسانوں کا خدا بنا رہے یا اپنے مناسب حصے سے زیادہ فوائد حاصل کرے تو یہ طاغوت کی راہ میں لڑنا ہے، اور اس کے مقابلے میں راہ خدا کی جنگ وہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ خدا کا قانون عدل دنیا میں قائم ہو، لڑنے والا خود بھی پابندی کرے اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کرائے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝

آخرت میں ہم نے عزت کا مقام ان لوگوں کے لئے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنا اور فساد کرنا نہیں چاہتے اور عاقبت کی کامیابی تو خدا ترس لوگوں کے لئے ہے"

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت

کیا، راہِ خدا کی جنگ سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص مال کے لئے جنگ کرتا ہے، دوسرا شخص بہادری کی شہرت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے تیسرے شخص کو کسی سے عداوت ہوتی ہے یا قومی حمیت کا جوش ہوتا ہے اس لئے جنگ کرتا ہے۔ ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے"۔ "آنحضرتؐ نے جواب دیا" کسی کی بھی نہیں۔ فی سبیل اللہ تو صرف اس شخص کی جنگ ہے جو خدا کا بول بالا کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا"۔

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لاالٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لاالٰہ

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے جنگ کی اور اس کے دل میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی حاصل کرنے کی نیت ہوئی تو اس کا اجر ضائع ہوگیا"۔ اللہ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو محض اس کی خوشنودی کے لئے ہو، کسی شخص یا جماعتی غرض کے لئے نہ ہو۔

کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات — آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا — اوّل و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام — ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام — مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

پس جہاد کے لئے فی سبیل اللہ کی قید اسلامی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہے[1] مجرد جہاد تو دنیا میں سب ہی جاندار کرتے ہیں ہر ایک اپنی مقصد کی تحصیل کے لئے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے۔ لیکن مسلمان، جس انقلابی جماعت کا نام ہے اس کے انقلابی نظریات میں سے ایک اہم ترین نظریہ بلکہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اپنی جان و مال کھپاؤ، دنیا کی ساری سرکش طاقتوں سے لڑو، اپنے جسم و روح کی ساری طاقتیں خرچ کر دو نہ اس لئے کہ دوسرے سرکشوں کو ہٹا کر تم ان کی جگہ لے لو، بلکہ صرف اس لئے کہ دنیا سے سرکشی و طغیانی مٹ جائے

---

[1] یہ ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے عظیم الشان ٹھوکر کھائی ہے، انھوں نے مجرد جہاد اور جہاد فی سبیل اللہ کے فرق کو نظر انداز کر دیا جس کی وجہ سے قومی استعلاء و استکبار کی کوشش اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی کوشش میں کوئی وجہ امتیاز باقی نہ رہی۔

اور خدا کا قانون دنیا میں نافذ ہو۔

یہی دین محکم، یہی فتح باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

جہاد کے اس مفہوم اور فی سبیل اللہ کی اصلی معنویت کو مختصراً بیان کر دینے کے بعد اس دعوت انقلابی کی تھوڑی سی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جا سکے کہ اس دعوت کے لئے جہاد کی حاجت کیا ہے اس کی غایت (OBJECTIVE) کیا ہے۔

اسلام کی دعوت انقلاب کا خلاصہ یہ ہے:

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری!

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ

"اے انسان! صرف اپنے اس رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"

اسلام مزدوروں یا زمینداروں یا کاشتکاروں یا کارخانداروں کو نہیں پکارتا بلکہ تمام انسانوں کو پکارتا ہے۔ اس کا خطاب انسان سے بہ حیثیت انسان ہے اور وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اگر تم خدا کے سوا کسی کی بندگی، اطاعت فرماں برداری کرتے ہو تو اسے چھوڑ دو۔ اور اگر خود تمہارے اندر خدائی کا داعیہ ہے تو اسے بھی نکال دو کہ دوسروں سے اپنی بندگی کرانے اور دوسروں کا سر اپنے آگے جھکوانے کا حق بھی تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تم سب کو ایک خدا کی بندگی قبول کرنا چاہئے اور اس کی بندگی میں سب کو ایک سطح پر آجانا چاہئے۔

آؤ ہم اور تم ایک ایسی بات پر جمع ہو جائیں جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور خداوندی میں کسی کو شریک بھی نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے بجائے امر و نہی کا مالک بھی نہ بنائے۔

(القرآن)

وہی سجدہ ہے لائقِ احترام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

یہ عالمگیر اور کلی انقلاب کی دعوت تھی اس نے پکار کر کہا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ "حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے" کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ بذات خود انسان کا حکمراں بن جائے اور اپنے اختیار سے جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس سے چاہے روک دے کسی انسان کو بالذات امر و نہی کا مالک سمجھنا دراصل خدائی میں اسے شریک کرنا ہے اور یہی بنائے فساد ہے۔ اللہ نے انسان کو جس صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے اور زندگی بسر کرنے کا جو سیدھا راستہ بتایا ہے اس سے انسان کے ہٹنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ خدا کو بھول جائیں اور نتیجۃً خود اپنی حقیقت کو بھی فراموش کر دیں اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف بعض اشخاص یا خاندان یا طبقے خدائی کا کھلا یا چھپا داعیہ لے کر اٹھتے ہیں اور اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اپنا بنا لیتے ہیں اور دوسری طرف اسی خدا فراموشی و خود فراموشی کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کا ایک حصہ ان طاقتوروں کی خداوندی مان لیتا ہے۔ اور ان کے حق کو تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ حکم کریں اور وہ اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیں یہی دنیا میں ظلم و فساد اور ناجائز انتفاع EXPLOITATION کی بنیاد ہے۔

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

اور اسلام پہلی ضرب اسی پر لگاتا ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقان نے فقیرِ رہ نشیں

وہ ہانکے پکارے کہتا ہے:-

"ان لوگوں کا حکم ہرگز نہ مانو جو اپنی حد سے گذر گئے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔"

"اس شخص کی اطاعت ہرگز نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی

خواہشات نفس کا بندہ بن گیا اور جس کا کام افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

"خدا کی لعنت ہو ان ظالموں پر جو خدا کے بنائے ہوئے بندگی کے سیدھے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں"

وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؟ یہ بہت سے چھوٹے بڑے خداجن کی بندگی میں تم پسے جا رہے ہو ان کی بندگی قبول ہے، یا اس ایک خدا کی جو سب سے زبردست ہے ؟ اگر اس خدائے واحد کی بندگی قبول نہ کرو گے تو ان چھوٹے اور جھوٹے خداؤں کی آقائی سے تمہیں کبھی نجات نہ مل سکے گی، یہ کسی نہ کسی طور سے تم پر تسلط پائیں گے اور فساد برپا کر کے رہیں گے۔

وہ سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کے نظام حیات کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں ان کا یہی وطیرہ ہے۔ (النحل)

اور جب وہ اقتدار پا لیتا ہے تو زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔ کھیتوں کو خراب اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ (البقرہ)

یہاں پوری تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوتِ توحید و خدا پرستی محض اس معنی میں ایک مذہبی عقیدہ کی دعوت نہ تھی جس میں اور دوسرے مذہبی عقائد کی دعوت ہوا کرتی ہے، بلکہ حقیقت میں یہ ایک اجتماعی انقلاب SOCIAL REVOLUTION کی دعوت تھی۔ اس کی ضرب بلاواسطہ ان طبقوں پر پڑتی تھی جنھوں نے مذہبی رنگ میں پروہت بن کر، یا سیاسی رنگ میں بادشاہ یا رئیس یا حکمراں گروہ بن کر یا معاشی رنگ میں مہاجن اور زمیندار اور اجارہ دار بن کر عامۃ الناس کو اپنا بندہ بنا لیا تھا۔ یہ کہیں اعلانیہ اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنے ہوئے تھے، دنیا سے اپنے پیدائشی یا طبقاتی حقوق کی بنا پر اطاعت و بندگی کا مطالبہ کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ اور اَنَا رَبُّكُمُ

الاعلیٰ اور اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً اور کسی جگہ انھوں نے عامۃ
الناس کی جہالت کو استعمال کرنے کے لئے بتوں اور ہیکلوں کی شکل میں
مصنوعی خدا بنا رکھے تھے جن کی آڑ پکڑ کر یہ اپنے خداوندی حقوق بندگان خدا سے تسلیم
کراتے تھے۔

نسلِ قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

پس کفر و شرک اور بت پرستی کے خلاف اسلام کی دعوت اور خدائے واحد
کی بندگی و عبودیت کے لئے اسلام کی تبلیغ براہِ راست حکومت اور اس کو سہارا دینے
والے یا اس کے سہارے چلنے والے طبقوں کی اغراض سے متصادم ہوئی تھی اسی وجہ سے
جب کبھی کسی نبی نے یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ کی صدا بلند کی
حکومت وقت فوراً اس کے مقابلے میں آن کھڑی ہوئی اور تمام ناجائز انتفاع کرنے
والے طبقے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

کیوں یہ محض ایک مابعد الطبیعی قضیہ METAPHYSICAL PROFOSITION
کا بیان نہ تھا بلکہ، ایک اجتماعی انقلاب کا اعلان تھا، اور اس
میں پہلی آواز سنتے ہی سیاسی شورش کی بو سونگھ لی جاتی تھی۔

اسلامی دعوت انقلاب کی خصوصیت

اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب انقلابی
لیڈر تھے اور سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے انقلابی لیڈر ہیں لیکن
جو چیز دنیا کے عام انقلابیوں اور ان خدا پرست انقلابی لیڈروں کے درمیان واضح خطِ
امتیاز کھینچتی ہے وہ یہ کہ دوسرے انقلابی لوگ خواہ کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہوں

عدل اور توسط کے صحیح مقام کو نہیں پاسکتے، وہ یا تو خود مظلوم طبقوں میں سے اٹھتے ہیں یا انکی حمایت کا جذبہ لے کر اٹھتے ہیں اور پھر سارے معاملات کو انھیں طبقوں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر غیر جانبدارانہ اور خالص انسانیت کی نظر نہیں ہوتی بلکہ ایک طبقہ کی طرف غصہ و نفرت کا اور دوسرے طبقہ کی طرف حمایت کا جذبہ لئے ہوتی ہے وہ ظلم کا ایسا علاج سوچتے ہیں جو نتیجۃً ایک جوابی ظلم ہوتا ہے۔ ان کے لئے انتقام حسد اور عداوت کے جذبات سے پاک ہو کر ایک ایسا معتدل اور متوازن اجتماعی نظام تجویز کرنا ممکن نہیں ہوتا جس میں مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح ہو۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام خواہ کتنے ہی ستائے گئے ہوں اور کتنا ہی ان پر ان کے ساتھیوں پر ظلم کیا گیا ہو ان کی انقلابی تحریک میں کبھی ان کے شخصی جذبات کا اثر آنے نہیں پاتا۔ وہ براہ راست خدا کی ہدایت کے تحت کام کرتے تھے اور خدا چونکہ انسانی جذبات سے منزہ ہے کسی انسانی طبقہ سے اس کا مخصوص رشتہ نہیں، نہ کسی دوسرے انسانی طبقہ سے اسکو کوئی شکایت یا عداوت ہے، اس لئے خدا کی ہدایت کے تحت انبیاء علیہم السلام تمام معاملات کو بے لاگ انصاف کے ساتھ اس نظر سے دیکھتے تھے کہ تمام انسانوں کی مجموعی فلاح و بہبود اور انھوں ظالم طبقوں کی بھی حقیقی فلاح و بہبود کس چیز میں ہے اور کس طرح ایک ایسا نظام بنایا جائے جس میں ہر شخص اپنے جائز حدود کے اندر رہ سکے اپنے جائز حقوق سے متمتع ہو سکے اور افراد کے باہمی روابط نیز فرد و جماعت کے باہمی تعلق میں کامل توازن قائم ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی انقلابی تحریک کبھی طبقاتی نزع CLASS WAR میں تبدیل نہ ہونے پائی انھوں نے، اجتماعی تعمیر نو SOCIAL RECONSTRUCTION اس طرز پر نہیں کی کہ ایک طبقہ کو دوسرے طبقے پر مسلط کر دیں۔ بلکہ اس کے لئے عدل کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں تمام انسانوں کے لئے ترقی اور مادی و روحانی سعادت کے یکساں امکانات رکھے گئے تھے۔

اس مختصر مقالہ میں میرے لئے اس اجتماعی نظام SOCIAL ORDER

کی تفصیلات پیش کرنا مشکل ہے جو اسلام نے تجویز کی ہیں۔ یہاں اپنے موضوع کے حدمیں رہتے ہوئے جس بات کو مجھے واضح کرنا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ اور عبادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک جامع سسٹم ہے جو دنیا سے زندگی کے ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹانا چاہتا ہے اور ان کی جگہ اپنا پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے۔ جس کو وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے سب سے بہتر سمجھتا ہے۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اس تخریب و تعمیر اور انقلاب و اصلاح کے لئے وہ کسی ایک قوم یا گروہ کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ وہ خود ان ظالم طبقوں اور ناجائز انتفاع کرنے والے گروہوں، حتیٰ کی بادشاہوں اور رئیسوں کو بھی پکارتا ہے کہ آؤ اس جائز حد کے اندر رہنا قبول کرلو جو تمہارے لئے امن و سلامتی ہے یہاں کسی انسان سے دشمنی نہیں ہے بلکہ دشمنی جو کچھ بھی ہے ظلم سے ہے، فساد سے ہے، بداخلاقی سے ہے۔ اس بات سے ہے کہ کوئی شخص اپنی فطری حد سے تجاوز کرکے وہ کچھ حاصل کرنا چاہے جو فطرت اللہ کے لحاظ سے اس کا نہیں ہے۔

یہ دعوت جو لوگ قبول کرلیں خواہ وہ کسی طبقے، کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک کے ہوں یکساں حقوق اور مساویانہ حیثیت سے اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی تیار ہوتی ہے جسے قرآن "حزب اللہ" کے نام سے یاد کرتا ہے اور جس کا دوسرا نام "اسلامی جماعت" یا "امت مسلمہ" ہے۔

بتانِ رنگِ و بو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

یہ پارٹی وجود میں آتے ہی اپنے مقصدِ وجود کی تحصیل کے لئے جہاد شروع کردیتی ہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم — نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیل

اس عین وجود کا اقتضاء یہی ہے کہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی کو مٹانے کی کوشش کرے اور اسکے مقابلے میں تمدن و اجتماع کے اس معتدل و متوازن ضابطہ کی حکومت قائم کرے جسے قرآن ایک جامع لفظ "کلمۃ اللہ" سے تعبیر کرتا ہے۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہے نیستاں کے واسطے پیدا

اگر یہ پارٹی حکومت کو بدلنے کی اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کرے تو اس کے وجود میں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ کسی اور مقصد کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہے اور اس جہاد کے سوا اس کی ہستی کا اور کوئی مصرف ہی نہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

قرآن اس کی پیدائش کا ایک ہی مقصد بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے۔

تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین Preachers اور مبشرین Missionaries کی جماعت نہیں ہے بلکہ خدائی فوج داروں کی جماعت ہے۔

(لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ)

قدرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ، فساد، بداخلاقی، طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے۔ ارباب من دون اللہ کو ختم کر دے اور بدی کی جگہ نیکی قائم کرے، قَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ[1]

---

[1] ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت صرف خدا کے لئے ہو جائے۔

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ؕ[۱] ـــ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ[۲] ـــ لہٰذا اس پارٹی کے لئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلام خس و خاشاک؟

کیونکہ مفسدانہ نظام تمدن ایک فاسد حکومت کے بل پر ہی قائم ہوتا ہے اور ایک صالح نظام تمدن اس وقت تک کسی طرح قائم ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکومت مفسدین سے مسلوب ہو کر مصلحین کے ہاتھ میں نہ آجائے۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

دنیا کی اصلاح سے قطع نظر جماعت کے لئے خود اپنے مسلک پر عامل ہونا بھی غیر ممکن ہے اگر حکومت کا نظام کسی دوسرے مسلک پر قائم ہو، کوئی پارٹی جو کسی سسٹم کو برحق سمجھتی ہو کسی دوسرے سسٹم کی حکومت میں اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ایک اشتراکی مسلک کا آدمی اگر انگلستان یا امریکہ میں رہ کر اشتراکیت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہے تو کسی طرح اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتا

---

[۱] اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ ہو گا اور بڑا فساد برپا رہے گا۔"

[۲] وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ اور حق کی اطاعت کا صحیح ضابطہ دے کر بھیجا ہے تاکہ تمام اطاعتوں کو مٹا کر اسی ایک اطاعت کو سب پر غالب کر دے خواہ وہ لوگ اس پر راضی نہ ہوں جو خداوندی میں دوسروں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

کیوں کہ سرمایہ داری اور نازیت کا ضابطۂ حیات حکومت کی طاقت سے بجبر اس پر مسلط ہو گا اور وہ اس کی قہرمانی سے کسی طرح بچ نہ سکے گا اسی طور پر ایک مسلمان بھی اگر کسی غیر اسلامی نظام حکومت میں رہ کر اسلامی اصول پر زندگی بسر کرنا چاہئے تو اس کا کامیاب ہونا بھی محال ہے، جن قوانین کو وہ باطل سمجھتا ہے، جن ٹیکسوں کو وہ حرام سمجھتا ہے وہ سب کے سب اس پر اس کے گھر بار پر، اس کی اولاد پر اس طرح مسلط ہو جائیں کہ وہ کسی طرح ان کی گرفت سے نکل نہ سکے گا۔

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

لہٰذا جو شخص یا گروہ کسی مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو وہ اپنے فطری اعتقاد کے اقتضاء ہی سے اس امر پر مجبور ہوتا ہے کہ مسلک مخالف کی حکومت کو مٹا دے اور خود اپنے مسلک کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے مسلک پر عمل کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ اس کوشش سے غفلت برتتا ہے تو اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ وہ درحقیقت اپنے عقائد ہی میں جھوٹا ہے۔

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

"اے نبی! خدا تمہیں معاف کرے، تم نے ان لوگوں کو جہاد کی شرکت سے علیحدہ رہنے کی اجازت کیوں دے دی؟ حالانکہ جہاد ہی وہ کسوٹی ہے جس سے تم پرکھ سکتا ہے کہ اپنے ایمان میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون، جو لوگ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ انھیں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنے سے معذور رکھا جائے۔ ایسی درخواست صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر"

جہاں میں تو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا — کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارہ یا کہ زجاج

ان الفاظ میں قرآن نے صاف اور صریح فتویٰ دے دیا ہے کہ اپنے اعتقاد میں کسی جماعت کے صادق ہونے کا واحد معیار یہی ہے کہ وہ جس مسلک پر اعتقاد

رکھتی ہو اسکو حکمراں بنانے کیلئے جان و مال سے جہاد کرے، اگر تم اپنے اوپر مسلک مخالف کی حکومت کو گوارا کرتے ہو تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ تم اپنے اعتقاد میں جھوٹے ہو اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ آخر کار کلمۂ اسلام کے مسلک پر تمہارا نام نہاد عقیدہ بھی باقی نہ رہے گا۔ ابتداء میں تم مسلکِ مخالف کی حکومت کو بکراہیت گوارا کرو گے، پھر رفتہ رفتہ تمہارے دل اس سے مانوس ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ کراہت رغبت میں بدل جائے گی اور آخر میں نوبت اس حد تک پہونچے گی کہ مسلک مخالف کی حکومت قائم رہنے اور ہونے میں تم خود مددگار بنو گے۔ اپنی جان و مال سے جہاد اسی لئے کرو گے کہ مسلک اسلام کے بجائے مسلک غیر اسلام قائم ہو یا قائم رہے۔ تمہاری اپنی طاقتیں مسلک اسلام کے قیام کی مزاحمت میں صرف ہونے لگیں گی، اور یہاں پہنچ کر تم میں اور کافروں میں اسلام کے منافقانہ دعویٰ، ایک بدترین جھوٹ، ایک پُرفریب نام کے سوا کوئی فرق نہ رہے گا۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ❊ نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

حدیث میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس نتیجہ کو صاف صاف بیان فرما دیا ہے:۔
اس خدا کی جسکے ہاتھ میں میری جان ہے یا تو تمہیں ایسا کرنا پڑیگا کہ نیکی حکم کرو اور بدی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف بزور موڑ دو پھر اللہ کے قانون فطرت کا یہ نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا بدکاروں کے دلوں کا اثر تمہارے دلوں پر پڑ جائے اور ان کی طرح تم بھی ملعون بن کر رہو۔

عالمگیر انقلاب

اس بحث سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی جہاد کا مقصود غیر اسلامی نظام حکومت کو مٹا کر اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث ❊ مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اگرچہ ابتداءً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کے نظام حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن ان کی آخری منزلِ مقصود ایک عالمگیر انقلاب (World Revolution) کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی انقلابی مسلک جو قومیت کے بجائے انسانیت کی فلاح کے اصول لے کر اٹھا ہو، اپنے انقلابی مطمح نظر کو کبھی ایک ملک یا ایک قوم

کے دائرے میں محدود نہیں کر سکتا، بلکہ وہ اپنی فطرت کے عین اقتضاء ہی سے مجبور ہے کہ عالم گیر انقلاب کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ جو جغرافی حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر میں کسی دریا پہاڑ کے اس پار حق ہوں تو اس پار بھی حق ہی ہوں نوعِ انسانی کی کسی حصّہ کو بھی مجھ سے محروم نہ رہنا چاہیئے۔ انسان جہاں بھی ظلم و ستم کا اور افراط و تفریط کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے وہاں اس کی مدد کے لئے پہنچنا میرا فرض ہے۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حُسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں ان مردوں عورتوں اور بچوں کے لئے نہیں لڑتے جنھیں کمزور پا کر دبا لیا گیا ہے اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے کارفرما ظالم ہیں۔"

علاوہ بریں قومی و ملکی تقسیمات کے باوجود انسانی تعلقات اور روابط کچھ ایسی عالمگیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ملک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہو جائے لہٰذا مسلم پارٹی کیلئے اصلاحِ عمومی اور تحفظ خودی، دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام کی حکومت قائم کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں، اس نظام کو تمام اطراف عالم میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دے گی کہ اس مسلک کو قبول کرے جس میں ان کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہو گی تو وہ لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور ان کی جگہ اسلامی حکومت قائم کریگی۔

یا وسعت افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اسی کو اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی، مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آنحضرتؐ کے بعد جب حضرت ابو بکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انھوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کیا اور پھر حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔ مصر و شام و روم و ایران کے عوام اوّل اوّل اس کو عرب کی امپیریلسٹ پالیسی سمجھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ جس طرح پہلے ایک قوم دوسری قوم کو غلام بنانے کے لئے نکلا کرتی تھی۔ اسی طرح اب بھی ایک قوم اسی غرض کے لئے نکلی ہے۔ اس غلط فہمی کی بناء پر یہ لوگ قیصر و کسریٰ کے جھنڈے تلے مسلمانوں سے لڑنے کیلئے نکلے۔ مگر جب ان پر مسلم پارٹی کے انقلابی مسلک کا حال کھلا، جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ جفا کارانہ قوم پرستی Aggressive - Nationalism کے علم بردار نہیں ہیں بلکہ قومی اغراض سے پاک ہیں اور محض ایک عادلانہ نظام قائم کرنے آئے ہیں اور ان کا مقصد ان ظالم طبقوں کی خداوندی کو ختم کرنا ہے جو قیصریت و کسریت کی پناہ میں ہم کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ تو ان کی اخلاقی ہمدردیاں مسلم پارٹی کی طرف جھک گئیں۔ وہ قیصر و کسریٰ کے جھنڈے سے الگ ہوتے چلے گئے اور اگر مارے باندھے سے فوج میں بھرتی ہو کر لڑنے آئے بھی تو بیدلی سے لڑے۔ یہی سبب ہے ان حیرت انگیز فتوحات کا جو ابتدائی دور میں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں اور یہی سبب ہے اس کا کہ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد جب ان ممالک کے باشندوں نے اسلامی نظام اجتماعی کو عملاً کام کرتے دیکھا تو وہ خود فوج در فوج اس بین الاقوامی پارٹی میں شریک ہوتے چلے گئے اور خود اس مسلک کے علم بردار بن کر آگے بڑھے تاکہ دوسرے ملکوں میں بھی اس کو پھیلا دیں۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر جب آپ غور کریں گے تو یہ بات بآسانی آپ

کی سمجھ میں آجائے گی کہ جنگ کی جو تقسیم جارحانہ Offensive اور مدافعانہ Defensive کی اصطلاحوں میں کی گئی ہے اس کا اطلاق سرے سے اسلامی جہاد پر ہوتا ہی نہیں۔ یہ تقسیم صرف قومی اور ملکی لڑائیوں پر ہی منطبق ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اصطلاحاً "حملہ" اور "مدافعت" کے الفاظ ایک ملک یا ایک قوم کی نسبت سے ہی بولے جاتے ہیں۔ مگر جب ایک بین الاقوامی پارٹی ایک جہانی نظریہ و مسلک کو لے کر اٹھے اور تمام قوموں کو انسانی حیثیت سے اس مسلک کی طرف بلائے، اور ہر قوم کے آدمیوں کو مساویانہ حیثیت سے اپنی پارٹی میں شریک کرے اور محض مسلک مخالف کی حکومت کو مٹا کر اپنے مسلک کی حکومت قائم کرنے کے لئے جد و جہد کرے تو ایسی حالت میں اصطلاحی حملہ اور اصطلاحی مدافعت کا قطعاً کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا بلکہ اگر اصطلاح سے قطع نظر کر لی جائے تب بھی اسلامی جہاد پر جارحانہ اور مدافعانہ کی تقسیم منطبق نہیں ہوتی اسلامی جہاد بیک وقت جارحانہ بھی ہے اور مدافعانہ بھی۔ جارحانہ اس لئے کہ مسلم پارٹی مسلک مخالف کی حکمرانی پر حملہ کرتی ہے اور مدافعانہ اس لئے کہ وہ خود اپنے مسلک پر عامل ہونے کے لئے حکومت کی طاقت حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ پارٹی ہونے کی حیثیت سے اسکا کوئی گھر نہیں کہ وہ اس کی مدافعت کرے۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دہلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

اس کے پاس محض اپنے اصول ہیں جن کی وہ حمایت کرتی ہے اسی طرح مخالف پارٹی کے بھی گھر پر وہ حملہ نہیں کرتی بلکہ اس کے اصولوں پر حملہ کرتی ہے اور اس حملہ کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اس سے زبردستی اس کے اصول چھڑائے جائیں۔ بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ اس کے اصولوں سے حکومت کی طاقت چھین لی جائے۔

یہیں سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظام کی حکومت میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے جو کسی دوسرے عقیدے و مسلک کے متبع ہوں۔ اسلام کا جہاد لوگوں کے عقیدہ و مسلک اور ان کے طریق عبادات یا قوانین معاشرت سے تعرض نہیں کرتا۔ وہ ان کو پوری آزادی دیتا ہے کہ جس عقیدے پر چاہیں رہیں اور جس مسلک پر

چاہیں چلیں۔ البتہ وہ ان کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ ایسے کسی طریقے پر حکومت کا نظام چلائیں جو اسلام کے نگاہ میں فاسد ہے۔ نیز وہ ان کے اس حق کو بھی نہیں مانتا کہ وہ معاملات کے ان طریقوں کو اسلامی نظام حکومت میں جاری رکھیں جو اسلام کے نزدیک اجتماعی فلاح کے لئے مہلک ہیں۔ مثلاً وہ حکومت کا نظام ہاتھ میں لیتے ہی سودی کاروبار کی تمام صورتوں کو مسدود کر دے گا۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جُوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

جوئے کی ہرگز اجازت نہ دے گا۔ خرید و فروخت اور مالی لین دین کی ان تمام شکلوں کو روک دے گا جو اسلامی قانون میں حرام ہیں۔ قحبہ خانوں اور فواحش کے اڈوں کو کلیتہً بند کر دے گا۔ غیر مسلم عورتوں کو ستر کے کم سے کم حدود کی پابندی پر مجبور کرے گا اور انھیں تبرج جاہلیت کے ساتھ پھرنے سے روک دے گا۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ، آئینۂ دل ہے مکدر

سینما پر احتساب قائم کرے گا اور تمام غیر اخلاقی عناصر کو اس سے نکال دے گا کسی گروہ کو مخلوط تعلیم کی اجازت نہ دے گا۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

اس قسم کے اور بہت سے امور ہیں جس میں ایک اسلامی نظام حکومت نہ صرف اجتماعی فلاح و بہبود کی خاطر بلکہ خو اپنے تحفظ (SELF-DEFENCE) کی خاطر بھی ان تمدنی معاملات کی اجازت نہ دے گا جو غیر مسلموں کے مسلک میں چاہے ناجائز نہ ہوں، مگر اسلام کی نگاہ موجب فساد و ہلاکت ہے۔

اس باب میں اگر کوئی شخص اسلام پر نارواداری کا الزام عائد کرے تو اسے دیکھنا چاہیئے کہ دنیا کے کسی انقلابی و اصلاحی مسلک نے دوسرے مسلک والوں کے

کے ساتھ اتنی رواداری نہیں برتی ہے جتنی اسلام برتتا ہے دوسری جگہ تو آپ دیکھیں گے کہ غیر مسلک والوں کیلئے زندگی دوبھر کردی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ وطن چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن اسلام غیر مسلک والوں کو پورے امن کے ساتھ ہر قسم کی ترقی کرنے کا موقع دیتا ہے اور ان کے ساتھ ایسی فیاضی کا برتاؤ کرتا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

یہاں پہنچ کر مجھے پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہئے کہ اسلام کی نظر میں جہاد صرف وہی ہے جو محض فی سبیل اللہ ہو، اور اس جہاد کے نتیجہ میں جب اسلامی حکومت قائم ہو تو مسلمان کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ قیصر و کسریٰ کو ہٹا کر خود ان کی جگہ لے لیں۔ مسلمان اس لئے نہیں لڑتا اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں لڑ سکتا کہ اس کی ذاتی حکومت قائم ہو جائے ..... اور وہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لے اور ناجائز طور پر لوگوں کی گاڑھی محنتوں کا روپیہ وصول کر کے زمین میں اپنے جنتیں بنانے لگے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں جہاد فی سبیل الطاغوت ہے اور ایسی حکومت کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کا جہاد تو ایک خشک اور بے مزہ محنت ہے جس میں جان، مال اور خواہشات نفس کی قربانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

حافظ ہیں کلیسا میں کباب و مے گلگوں ❊ مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظۂ و پند

اگر یہ جہاد کامیاب ہو اور نتیجہ میں حکومت مل جائے تو سچے مسلمان حکمران پر ذمہ داریوں کا اس قدر بھاری بوجھ عائد ہوتا ہے کہ اس غریب کے لئے راتوں کی نیند اور دن کی آسائش حرام ہو جاتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں وہ حکومت و اقتدار کی ان لذتوں میں سے کوئی لذت بھی حاصل نہیں کر سکتا جن کی خاطر دنیا میں عموماً حکومت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلام کا فرمانروا نہ تو رعیت کے عام افراد سے ممتاز کوئی بالاتر ہستی ہے، نہ وہ عظمت و رفعت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے، نہ اپنے آگے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے، نہ قانون شریعت کے خلاف ایک پتہ ہلا سکتا ہے نہ اُسے اختیار حاصل ہے کہ اپنے کسی عزیز یا دوست یا خود اپنی ذات کو کسی ادنیٰ ہستی کے جائز مطالبہ سے بچا سکے، نہ وہ حق کے خلاف ایک جبہ لے سکتا ہے اور

نہ چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے، ایک متوسط درجہ کے مسلمان کو زندگی بسر کرنے کے لئے جتنی تنخواہ کافی ہوتی ہے اس سے زیادہ بیت المال سے ایک پائی لینا بھی اس کے لئے حرام ہے۔ وہ غریب نہ عالی شان قصر بنوا سکتا ہے، نہ خدم وحشم رکھ سکتا ہے نہ عیش و عشرت کے سامان فراہم کر سکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب رہتا ہے کہ ایک دن اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائے گا اور اگر حرام کا پیسہ، جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ۔ ظلم و بے انصافی کا ایک دھبہ اور خواہشات نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اُسے سخت سزا بھگتنی ہو گی۔

قلزم ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانہ میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اگر کوئی شخص حقیقت میں دنیا کا لالچی ہو تو اس سے بڑا کوئی بیوقوف نہ ہو گا اگر وہ اسلامی قانون کے مطابق حکومت کا بار سنبھالنے پر آمادہ ہو، کیوں کہ اسلامی حکومت کے فرماں روا سے تو بازار کے معمولی دکان دار کی پوزیشن زیادہ اچھی ہوتی ہے وہ دن کو خلیفہ سے زیادہ کماتا ہے اور رات کو آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے، خلیفہ بے چارے کو نہ اس کے برابر آمدنی نصیب ہو اور نہ رات کو چین سے سونا ہی نصیب۔

یہ بنیادی فرق ہے اسلامی اور غیر اسلامی حکومت میں۔ غیر اسلامی حکومت میں حکمراں گروہ اپنی خداوندی قائم کرتا ہے۔ اور اپنی ذات کے لئے ملک کے وسائل و ذرائع استعمال کرتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت میں حکمراں گروہ مجرد خدمت کرتا ہے اور عام باشندوں سے بڑھ کر اپنی ذات کے لئے کچھ حاصل نہیں کرتا۔ اسلامی حکومت کی سول سروس کو جو تنخواہیں ملتی تھیں، ان کا تقابل آج کل کی یا خود اس اس دور کی امپیریلسٹ طاقتوں کو سول سروس کے مشاہیروں سے کر کے دیکھئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی جہاں کشائی اور امپیریلزم کی عالم گیری میں روحی و جوہری فرق کیا ہے۔ اسلامی حکومت میں خراساں، عراق، شام و مصر کے گورنروں کی تنخواہیں آپ کے معمولی انسپکٹروں کے تنخواہوں سے بھی کم تھیں۔ خلیفہ اوّل حضرت

ابوبکرؓ صدیق صرف سو روپے مہینہ پر اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی تنخواہ ڈھیڑ سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔ دراں حالانکہ بیت المال دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتوں کے چھوڑے ہوئے خزانوں سے بھرپور ہو رہا تھا۔

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

اگرچہ ظاہر میں امپریلزم بھی ملک فتح کرتا ہے اور اسلام بھی۔ مگر دونوں کے جوہر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ ہے اس جہاد کی حقیقت جس کے متعلق آپ بہت کچھ سنتے رہے ہیں۔ اب اگر آپ مجھے دریافت کریں کہ

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

آج اسلام اور مسلم جماعت اور جہاد کا وہ تصور جو تم پیش کر رہے ہو کہاں غائب ہو گیا، اور کیوں دنیا بھر کے مسلمانوں میں بھی کہیں اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تو عرض کروں گا کہ یہ سوال مجھ سے نہ کیجئے بلکہ ان لوگوں سے کیجئے جنھوں نے مسلمانوں کی توجہ ان کے اصلی مشن سے ہٹا کر تمام دوسری غلط کاریوں اور ریاضتوں کی طرف پھیر دی۔

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی

جنھوں نے نجات اور فلاح اور حصول مقاصد کے لئے شارٹ کٹ تجویز کئے تاکہ مجاہدے اور جاں فشانی کے بغیر سب کچھ تسبیح پھرانے یا کسی صاحب جناب کی عنایت حاصل کر لینے ہی سے میسر آجائے۔

ہونگے نام جو قبروں کو تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

جنھوں نے اسلام کے کلیات اور اصول اور مقاصد سب کو لپیٹ کر تاریک گوشوں میں پھینک دیا اور مسلمانوں کے ذہن کو آمین بالجہر اور رفع یدین اور دیگر فروعی مسائل اور اسی قسم کے بے شمار جزئیات میں ایسا پھنسا دیا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مقصد تخلیق کو اور اسلام کی حقیقت کو قطعی بھول گئے۔

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائل نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب

اگر اس سے بھی آپ کی تشفی نہ ہو تو پھر یہ سوال ان امراء اور اصحاب اقتدار کے سامنے پیش کیجئے جو قرآن اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر قرآن کے قانون اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کا اس سے زیادہ کوئی حق اپنے اوپر تسلیم نہیں کرتے کہ کبھی ختم قرآن کرا دیا کریں اور کبھی میلاد کے جلسے کرا دیں اور کبھی اللہ میاں کو نعوذ باللہ ان کی شاعری کی داد دے دیا کریں۔

فقیہہ شہر بھی رُہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست

رہا اس قانون اور ہدایت کو عملاً نافذ کرنا تو یہ حضرات اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ سمجھتے ہیں کیوں کہ درحقیقت ان کا نفس ان پابندیوں کو قبول کرنے اور ان ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے جو اسلام ان پر عائد کرتا ہے، یہ بڑی سستی نجات طالب ہیں۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتان عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

یہ مقالہ BARROWED ہے۔ صرف مرتب کیا گیا ہے۔

اسلوبیات اقبال کی معروضی اکائیاں

اسلوبیات اقبال کا مطالعہ

میری تمام جستجو، کھوئے ہوؤں کی جستجو

مطالعہ اقبال پر اب تک جتنا کار ہائے نمایاں سرانجام پایا ہے، ان کی تفصیل کی سنجیدہ ترتیب دی جائے تو کئی ضخیم کتابیں معرض وجود میں آجائے گی اور یہ امر بالکل سچائی کا مصداق ہے کہ ان وضاحتی کتابوں کی پشت پر ایک عظیم الشان کتب خانہ موجود ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت سخت استعجاب کا باعث نہیں آج تک اسلوب اقبال کا تعین نہیں ہو سکا اور اس کے عناصر ترکیبی کی عناصر دریافت ہنوز باقی ہے۔

ناقدین اقبال نے خودی، عظمت، شکوہ، عشق، قوت، حرکت، آگ، جنگ، خون، بجلی، بادل، تریاق، الہام، پیغمبری، آسمان، انقلاب، زمانہ، حریت، انحراف، آندھی، سمندر، تسخیر اور تنویر وغیرہ الفاظ کی تکرار و تسلسل سے اقبال کے اسلوب کی شناخت کرنے کی سعی پیہم کی ہے۔ اور اس سعی میں تخیل، وجدان، ادراک، جذبہ، تخیلی تعقل یا حرکی تخیل، مابعد الطبیعات کے زیر اثر حال و قال کی منزلیں، مطالعہ، تجربہ اور اس سے ملتے جلتے دوسرے اصطلاحی الفاظ کو بے دریغ شامل کیا ہے۔ ساتھ ہی اس سعی کی فہرست میں ایجری، محاکات، علامت، تمثیل، استعارہ، تشبیہ اور جملہ صنائع و بدائع کی شمولیت کو بھی ضروری تصور کیا ہے۔ یہی "نہیں بلکہ ڈراما، مکالمہ، تاریخ، فلسفہ، جمالیات، عمران اور نفسیات وغیرہ میں چند حرفوں کے اضافہ سے ایک اشتقاقی لفظ تیار کر کے اسلوب اقبال کے سر تھوپنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی ہے۔ بعض ناقدین نے عرب، عجم، حجاز اور ہند کے چوکھٹے یا اس کے باہر آفاقیت، بین الاقوامیت، کلاسیکیت، رومانیت، مارکسیت، جدلیت، جدیدیت، وجودیت، یا اسی اسی نوع کی دوسری قدیم یا ادبی، سماجی، فکری یا دوسرے علوم کی معروف یا غیر معروف اصطلاحی لفظوں کے ذریعہ بھی اقبال کے اسلوبیاتی مطالعہ کا عجیب و مہیب نقشہ پیش کیا ہے اور اس نقاشی میں لفظ تو دور رہا، حرف، صوت، آواز، حرکت نیز علم الصوت (Phonetics)

) کے عمیق عنصروں کو اس انداز میں مرتسم کیا گیا کہ بس خدا کی پناہ! بیچاری لسانیات اس پورے عمل میں انگشت بدنداں محویت تماشائی کی صورت بنی رہتی ہے۔ بقیہ سب کچھ ہو لیکن اسلوب اقبال کا عرفان صیغۂ راز میں رہا۔ ؎

میری نظر میں ہے یہی جمال و زیبائی — کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک
مجھے سزا کیلئے بھی نہیں قبول وہ آگ — کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

"میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو ابوالکلام کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی ۔ اقبال کی نظم! میرے نزدیک اقبال اور ابوالکلام آزاد حقیقی معنوں میں مافوق البشر ہیں۔" (محشر خیال) مافوق البشر سے اگر RARE INDIUAL مراد ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں، ورنہ اس اصطلاح سے گمراہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ عظمت اقبال کسی رد مان پرست کے لفظ مافوق البشر میں پوشیدہ نہ ہو کر شاذ انسانیت کی بلندیوں سے عیاں و افشاں ہے۔ یہ فنکار کی وہ مستثنیٰ انفرادیت ہے جو اس کے انانیتی جلال میں کہیں نہ کہیں موجود ہے جس کا صاف معنی یہ ہے کہ "کچھ نہیں سوائے میرے" جو بلاشبہ الوہیت میں کھلم کھلا شرکت ہے اور جو وصف جلال کے پرستار لانجائنس جیسے مشرک کو بھی منظور نہیں۔ کبر کے لائق جل جلالہٗ ہے اور اللہ ہی متکبر ہے اور اسی کو صرف یہ حق ہے کہ روشنی سے کہے "ہو جا" اور روشنی ہو جائے اور تمام انانیتی بے مایہ ہیں جبرئیل و اسرافیل کی انانیت کی کیا گنتی ہے اس کے سامنے رسل، خلفاء اور اصحاب و افلاطون ارسطو، مارکس اور آئنس ٹین سب "ہو جا" حکم کے منتظر ہیں، اور ہو گئے ہیں اور اس ہونے میں زیادہ اور کم ہونا بھی مضمر ہے اور اس کم یا زیادہ ہونے میں میری تمہاری اور للو لال جی کی "میں" بھی شامل ہے اور جس نے اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے، رسول کی پیروی کی ہے، خلفاء پر نظر رکھی ہے اصحاب کو لوتا رہا اور افلاطون، مارکس اور آئنس ٹین کو تنقید حیات کی غراد پر چڑھایا ہے بیشک وہ شاذ۔ شاذ انسانیت کی مستثنیٰ انفرادیت ہے اور اسلوب اقبال کی مراد ہے

خودی کی خلوتوں میں کبریائی　　خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش　　خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اردو شاعری کی تاریخ میں صرف شیخ محمد اقبال کو یہ امتیاز و اختصاص حاصل ہے کہ اسنے تنہا اور یکتا محض ایک جنبش قلم سے جلال کو اپنی نگارشات میں سرایت کر دیا، گھسے پٹے پرانے اسالیب سے بغاوت کی اور شعر کو زندگی اور حرارت پہونچانے والے گرانقدر اسلوب، "اسلوب جلیل" سے نوازہ اور کوتاہ ذہنوں سے فوق البشر کا خطاب فتح کیا ؎

این راز ہے مردان حر کی درویشی
کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبت خویشی

عظیم تصورات کو تشکیل دینے کا ملکہ، طاقتور الہامی جذبہ اور شان و شوکت اور قوت اسلوب جلیل کی وہ صفات ہیں، جن سے رسائی حاصل کئے بغیر اسلوب اقبال کی شناخت ہی ممکن نہیں، شدید ترین جذبات پر قابو، الہامی جذبہ سرچشمہ اول ہے۔ افلاطون بھی اس پرشکوہ عظیم ترین جذبہ کا قائل ہے۔ یہ عظمت و شکوہ کی انتہا ہی تھی کی جس نے اعجاز موسوی اور ید بیضا کو بے حقیقت کر دیا اور کلام ربانی کو اس مقام پہ فائز کیا، جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ لیکن انسان میں اتنی زبردست سکت ودیعت کی گئی کہ وہ نہ صرف گفتار الٰہی کو تفہیم کے راستے سے صحیح سلامت گذار سکے بلکہ حرف شیریں کا ترجمان بھی بن سکے ؎

محمد بھی تیرا جبرئیل بھی قرآن بھی تیرا　　مگر یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا

دراصل اسلوب جلیل کی آگ میں دو طرح کی حرارتیں پوشیدہ ہیں۔ اول یہ کہ زور، رفتار۔ قوت اور شدت کے ساتھ بجلی کی گھن گرج اور چمک کی طرح نگاہ خرد کو خیرہ کرتی ہے کہ جس پر گرتی ہے، اس کو جلا دینا چاہتی ہے اور اسے اپنا جیسا بنا لیتی ہے۔ اور دوم یہ کہ وہ دور دور تک پھیلی ہوئی آگ کی طرح جو ہر بڑھتی ہوئی چیز کو نہایت تیزی سے جلا دیتی ہے۔ دراصل اس کے

اندر مستقل اور نہ بجھنے والے شعلہ کی طاقت ہے جو جس جگہ چاہے آگ لگا سکتا ہے اور اس کی زندگی جوہری خودی کے نور سے مجلی ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است

دین و سیاست کی وحدت اور عشق ہے نور حیات۔ عشق ہے نار حیات کا امتزاج قلم اقبال کا اعجاز ہے۔ دراصل اقبال کے علوی قلم کو ایسی جلالت منظور نہیں جو صرف ظلم و قہر کے مرادف ہو بلکہ جس میں ایسی شگفتگی و توانائی بھی مضمر ہو جو چنگیزیت کا سر بھی قلم کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ لیکن اقبال کا یہ وجدانی اور ذوقی انداز جس پر شگفتگی و ملاحت کا اسقدر غلبہ ہے کہ دین و سیاست کا ایک اکائی کی صورت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ دین و سیاست کا یہ پاکیزہ رشتہ اقبال کے اسلوب جلیل کے سوا پوری اردو شاعری میں کسی بھی فنکار کے قلم کے حصہ میں نہیں آیا، اقبال کا قلم آتش خودی سے مل کر ایک ایسی متحرک کیفیت پیدا کرتا ہے، جس سے تاتار اور تیمور کی کیا بساط، بڑے بڑے کج کلاہوں اور فکر و نظر کے اور نگ نشینوں کے سفاک قلوب بھی متزلزل ہو اٹھتے ہیں اور ان کے چہروں پر ہراساں و پریشاں تصویریں بننے لگتی ہیں ؎

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشہ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

ڈایونیسیس اپنی کتاب "آن دی ایجمنٹ ورڈس" میں اسلوبیات سے متعلق نہایت عمدہ نکات پیش کرتا ہے اور اسلوب کے تین اجزائے ترکیبی سے بحث کرتا ہے یعنی نابغہ روزگار شخصیت، گہرا مطالعہ اور انتھک ریاضت، آپ غور کیجئے تو وضاحت کی چنداں ضرورت باقی نہ رہ جائے گی۔ اقبال کے مقابلہ میں کوئی دوسری نابغہ، عالم اور مشقتی شخصیت اردو شعریات کے حصہ میں نہیں آئی۔ دراصل ڈایونیسیس کا نظریہ اسلوب جلیل کا طرۂ امتیاز ہے جو صرف اقبال کے حصہ میں آیا ہے۔ اسلوبیات کی تنقیدی تاریخ میں۔ کیٹو کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس نے اسلوب جلیل کی بنا رکھی۔ کیٹو اپنے بیٹے مارکس

(۱۴۹ ق م) سے مقرر کی جو تعریف بیان کرتا ہے، قابل توجہ ہے، " وہ عظیم روح جو فن خطابت سے مزین ہے، خطیب ہے، یونانی الفاظ ہیں

اور کیٹو سے یہ الفاظ بھی منسلک کئے جاتے ہیں

یعنی اگر تمہارے خیالات میں تہذیب ہے تو لفظ بھی تمہاری تقلید کریں گے" شاید کیٹو کی مراد اقبال کا اسلوب جلیل ہے ؂

عطا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب سرود!

علم، لفظ، آواز، اور دانشوری سب کو سمیٹتے ہوئے اے۔ آئی۔ ٹیلر اپنی کتاب، "پلیٹو" میں اسلوب جلیل کے اجزائے ترکیبی کو مزید واشگاف کرتا ہے، خشک اور سپاٹ اسلوب کی جگہ مزین اور آراستہ اسلوب کی تشکیل اور تشریح کا سارا کرشمہ گور کی اس کا ہے۔ اس لئے افلاطون نے اپنے فن خطابت سے متعلق مسائل کو گورکی اسکی زبان سے کہلواتا ہے بنی نوع انسان کو آزادی فن اور آزادی ضمیر کا سبق پڑھواتا ہے۔ گورکی اس کے مطابق" طاقت میں ہی عالم انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ اور فن خطابت قوت و طاقت کے اظہار کے فن کے سبب ہی سب سے عظیم فن ہے ؏

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی

کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

عظیم روح اور نابغہ شخصیت دراصل اس حیات ابدی میں مضمر ہوتا ہے جس کی تابندگی جبرئیل و اسرافیل کے جبینوں کے مانند روشن ہے اسلوبیات کے مطالعہ کے تناظر میں شخصیت بہت اہم اور طاقت ور عنصر ہے جو بقول بفن

کا مصداق ہے یعنی شخص ہی اسلوب ہے۔ گبن کا خیال ہے کہ اسلوب شخصیت کا عکس ہے۔ بفن کے مشہور معروضہ کو علم الحیات کی روشنی میں پرکھنے کے قطع نظر، یہ دیکھنا لازم ہے کہ شخصیت اور اسلوب کا کیا رشتہ ہے اور کیا اقبال پھر ایک اسلوب کی صورت میں نمودار ہو پاتے ہیں یا نہیں ؟ لیکن ینگ

شخصیت کو چار حصوں میں منقسم کرتا ہے۔

۱۔ جسمانی سطح جس میں فنکار کی شکل و صورت، جسمانی قوت، حواس خمسہ وغیرہ کا مکمل احاطہ ہوتا ہے۔

۲۔ ذہنی سطح جس میں فنکار کی ذہانت، یادداشت، قوت متخیلہ، علم منطق اور فلسفہ وغیرہ آتے ہیں۔

۳۔ جذباتی سطح جس میں تاثر و جذبات و احساسات اور کیفیات کی پیچیدگیاں شامل ہیں۔

۴۔ سیرت یا اخلاقی سطح پر جس میں فطرت۔ اخلاق، قدر، اعمال ضروریات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

ان تمام سطحوں سے اسلوبیات کا رشتہ قائم ہوتا ہے اسی لئے گوئٹے نے اسلوب کو ذہنی نقل Copy of mind چیسٹر فیلڈ نے لباس ذہن Dress of thought ملٹن مرے نے فکر انسانی Thought of artist ہربرٹ ریڈ نے ذہنی اعمال، فکر، احساسات، جذبات اور ذہنی تحریک[۲]۔ ایف۔ ایل لوکس نے زندہ دلی اور سیرت نگاری، ہڈسن نے شخصی صفت شوپنہار نے دماغی صورت حال گاتی این یوکاک نے مصنف کی شخصیت کا ایک حصہ ہے، وہیلے نے شخصیت کا غیر منقسم حصہ نیومین نے ذریعہ تفکر، ایلیس نے فکر، اسلیڈ نے انفرادیت فکر و زبان۔ شیرن نے انفرادیت اظہار، جانسن نے شخصی۔ ددلے تے انفرادیت انہماک۔ کننگ نے فطرت فنکار، لوہین نے تاثر و اظہار، وہائٹ نے فنکار کا غیر منقسم اور خداداد حصہ، کار بیکس اور آرتھر کیچ نے فنکار کا اندرون، وبجلی نے لباس خیال، سیبک نے انفرادی اجتناب کالرج نے قوت متخیلہ کی پرواز کی آزمائش اور کسرو نے شخصیت کا اظہار قرار دیا ہے۔

اس طرح ایک جائزے کے مطابق اسلوب، جسمانی سطح اور ذہنی سطح سے دست و گریباں ہے۔ ذہنی سطح سے مراد ذہانت عقل و دانش، دماغ، قوتِ فکر، ذہنی عمل اور اس کا رد عمل سب آجاتا ہے جس میں فنکار کے تاثرات، احساسات، جذبات، زندہ دلی

---

[۱] ڈائی من شن آف کیریکٹر۔ اے۔ ای۔ ایم بیگ ۱۹۵۶ صفحہ ۹۷ - ۹۶ [۲] ماخوذ از بی۔ ایڈورڈ [۳] ایضاً
[۴] پرابلم آف اسٹائل حصہ ۱، [۵] انگلش پروز اسٹائل صفحہ ۸۵۔

اور تجربات شامل ہیں۔ ان ہی سے فنکار کی شخصیت، فطرت، اور اس کی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخصیت فنکار کے اسلوب کا حرولاینفک ہے۔ اس امر پر سسرو، گوئٹے، مرے لوکس، ریڈ، شوپنہار وغیرہ جیسے فنکار و نقاد ہی مصر نہیں ہیں بلکہ غور کیجئے تو بات اور پیچھے جاتی ہے اور سقراط تک جا پہنچتی ہے۔ سقراط سے یہ فقرہ منسوب ہے،

"انسان اپنے کلام سے پہچانا جاتا ہے"

افلاطون کے یہاں بھی اس قسم کے بہتیرے فقرے موجود ہیں اور نینکا نامی رومن فلسفی نے EPISTLE میں ان فقروں کو جمع کر دیا ہے۔ ارسطو نے بھی خطابت کے باب جو کچھ لکھا ہے۔ ان کا صاحب طرز فنکار کی شخصیت سے گہرا تعلق ہے۔ ارسطو نے فنکار کے فیصلہ اور اس کے احساس دروں کا کافی شد و مد سے بیان کیا ہے۔ ارسطو کا خیال ہے کہ فنکار اپنے فیصلے ایک خاص انداز میں صادر کرتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کے تاثرات و احساسات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر کرتا ہے۔ وہ خود ایسے تاثرات کے اظہار پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ نتیجتاً پڑھنے والے اس کے تاثرات کی نشاندہی کر سکتے ہیں اس پیچیدہ عمل میں جو چیز ادب کو یا فن پاروں کے شائقین کو متاثر کرتی ہے اور درحقیقت ان کے جذبات کا الاؤ روشن کرتی ہے، وہ فنکار کی شخصیت ہے جو اسلوب کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ فنکار کی شخصیت لمحہ بہ لمحہ متغیر ہوتی رہتی ہے اس پر ایسے بھی لمحات آتے ہیں جب وہ ریاکاری سے بالکل معریٰ اور خلوص کا پتلا ہوتا ہے اس مرحلے پر غیر موزوں نہ ہوگا اگر لارڈ چیسٹر فیلڈ کے نام جانسن کا شاہکار خط کا ذکر نہ کیا جائے۔ جیمس جانسن نے بے حد بے نیازی کا ثبوت دیا ہے۔ اور چیسٹر فیلڈ کی تعریف سے انکار کیا ہے۔ برخلاف اس کے، غالب نے نوابانِ رام پور کے نام حاجت طلبی اور غرض مندی کا جو خط لکھا اس سے یہ مراد نہیں کہ غالب خوددار تھے بلکہ فنکار کی شخصیت لمحہ بہ لمحہ متغیر ہوتی رہتی ہے [1] یہاں سوال قایم کیا

---

[1] ۔ اسلوب عابد علے عابد ۶۲ ۔ ۶۳ ۔ ۶۴

جاسکتا ہے کہ آخر شخصیت کیا ہے؟ لہٰذا چند اہم معروف تعریفیں جس سے شخصیت کا تعین ہو سکے، پیش نظر ہے:۔

شخصیت " PERSONALITY " کے مترادف ہے۔ PERSONALITY لیٹن لفظ۔ " PERSONA " کا ترقی یافتہ روپ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پرسونا کا استعمال ڈرامہ کے کرداروں کے لئے ہوتا تھا مگر آگے چل کر شخصیت کا اہم مترادف پرسنالیٹی نکل آیا۔ ۱؎ میک ڈگال نے شخصیت کو دماغی اشکال و اعمال اور گڈن نے انسان کا باطن نامہ ۳؎ کیٹل نے خصوصی حالات میں انسانی سلوک ۴؎ کرن نے ایک انسان کو دوسرے سے مختلف کرنے والا عناصر ۵؎ مارٹن پرنس نے فرد کی حیاتیاتی، طبعی اور دماغی قوتوں اور تجربوں ۶؎ سے عبارت کیا ہے۔

1) R. B. CATTELL: AN INTRODUCTION TO PERSONALITY STUTY 1950 P. 20

2) A SYNTHETIC UNITY OF ALL MENTAL FEATURE AND IN THEIR INTIMATE INTERPLAY - THE ENERGIES OF MAN 1932 P360

3) "PERSONALITY IS THE EXPRESSION OF MAN'S INNER LIFE."

4) PERSONALITY IS THAT WHICH DETERMINES BEHAVIOURS IN A DEFINED SITUATION." AN INTRODUCTION TO PERSONA-LITY STUDY P. 22

5) ALL THE ESSENTIAL PSYCHOLOGICAL PROCESS THAT DISTINGUISH ONE PERSON TO ANOTHER" PSYCHOLOGY 1955 P. 190

6) THE SUM TOTAL OF THE BIOLOGICAL INNATE DISPOSITION, IMPULSES, TENDENCIES, APPETITES AND INSTINCTS OF THE INDIVIDUAL AND THE DISPOSITION OF AND TENDENCIES ACQUIRE-D BY EXPERIENCE." THE UNCONSCIOUS 1929 P. 532

شخصیات کے ان نظریات کے پیش نظر اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار قابل مطالعہ ہیں؛ جو مختلف نقطہ ہائے نظر کا احاطہ کرتے ہیں۔ عہ

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے۔ کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

دل بینا بھی کر خدا سے طلب۔ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

نگاہِ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

نہ مومن ہے، نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری

خدا سے پھر وہی قلب و جگر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

روشنی لو تو ہوتی ہے جہاں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہ پاک

زمانہ اپنے حوادث چھپا نہیں سکتا
ترا حجاب ہے قلب و نظر کی ناپاکی

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے
نگاہ وہ ہے جو محتاج مہر و ماہ نہیں

کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے؟

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے تو موت مجھ سے
تو خدا جو، خدا نما ہوں میں

علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

کہہ رہا مجھ سے اے جویائے اسرار ازل
چشم و دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

انجام فرد ہے بے حضوری — یہ فلسفہ زندگی سے دوری

عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات — عارف و عامی بندہ لات و منات

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکہ اس پر — کس کی منزل ہے الٰہی! مرے کاشانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے — برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک — نہ تیری ضرب کاری ہے نہ میری ضرب کاری ہے

دل سوز سے خالی نگہ پاک نہیں ہے — پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

گرچہ زندانی اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ

آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے، وہ دل نہیں — پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

جس معنیٔ پیچیدہ کا تصدیق کرے دل — قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

میں تو نیاز ہوں مجھ سے حجاب اوّل! — کہ دل سے بڑھ کے میری نگاہ بے قابو

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے — عشق بے چارا نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

تو سمجھتا نہیں اے زاہد ناداں اس کو — رشک صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل

ہو گئی ہو چشم مظاہر پرست و آخر — تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں — جچتی نہیں ہے سلطنت روم و شام و لے

اقبال کے ان اشعار کے مطالعہ سے انسائیکلوآف برٹینکا کے ان الفاظ کی تصدیق ہو جاتی ہے، الفاظ ملاحظہ کیجیے۔

THE STYLE, ITS APPEAR, IS NOT THE MAN HIMSELF BUT THE ARTIST HIMSELF."

یہی وجہ ہے کہ اینکوسٹ نے بھی اس تعریف THE STYLE IS THE MAN HIMSELF میں مندرجہ ذیل قباحتیں محسوس کیں اور ان کا ذکر کرنا ضروری تصور کیا اگرچہ ان سے اتفاق کرنا مشکل نظر آتا ہے۔

(۱) اسلوبیات میں شمار کیے جانے والی خصوصیات محض شخصی نہیں ہوتیں

بلکہ مختلف چیزوں کے مجموعوں کا امتزاج ہوتی ہیں۔

(۲) تخلیق میں موجود مختلف عناصر سے مخصوص جوہر اور فنکار میں پائے جانے والے مخصوص جوہر کو کس طرح الگ کیا جاسکتا ہے؟

تو کیا پہلے سوال کا جواب اقبالیات کے تناظر میں یہ ہے کہ فنکار میں مختلف اوصاف مخلوط اور ملے ہوئے ہونے کے باوجود بھی کچھ اس طرح سے ہیں، جو فنکار کو الگ سے . شاذ . شاذ انفرادیت سے مالامال کرتے ہیں۔ اقبال اپنی پرجلال، مہیب اور بلند آہنگ شخصیت کے لئے نہ صرف اردو میں بلکہ عالمی ادب کی بساط پر مشہور رہے ہے، اور دوسرا سوال عملی نہیں ہے۔ کیونکہ کسی فنکار کی ایک سے زیادہ تخلیقات کا تجزیہ ان عناصر ظاہر کر دیتا ہے جس کو وہ خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ لہٰذا ان عناصر کو بہ آسانی الگ کیا جاسکتا ہے مگر اس لئے بے پناہ تجربہ، بصیرت اور وجدان کی ضرورت ہے اور یہاں اینکوسٹ سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ فنکار کے اظہار بیان کی مناسبت سے اسلوبیات کا ایک مخصوص گروپ بنایا جاسکتا ہے۔ خصوصاً اقبال جیسے فنکار جن کے اسلوب کے رگ و پے میں "جلال و زیبائی" پیوست ہے کی شناخت نہایت آسان کام ہے۔ کلام کا پر از جلال ہونا، سکتہ STUNNED POSITION رعب و دبدبہ اور پاکیزگی اقبال کے اسلوب کی شناخت کی معمولی چیزیں ہیں ثبوت کے طور پر چند اشعار مزید ملاحظہ کیجئے۔

جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن   جو فکر کی سرعت میں بجلی زیادہ تیز!

موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے   خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

یوں دادِ سخن دیتے ہیں مجھکو دیتے ہیں عراق و پارس

یہ کافر ہندی بے تیغ و سنان خون ریز

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں

خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں

ستارہ کیا مری تقدیر کا خبر دے گا — وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں
ضمیر پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق — نہ مال و دولتِ قارون نہ فکرِ افلاطوں

جان مدلٹن مرے علم سلوبیات کا ایک اہم نام ہے اس کی کتاب دی پرابلم آف اسٹائل" کے تناظر میں اسلوب اقبال کا تعین نہایت آسان کام ہے ۔۔ مرے کی اسلوبیاتی تنقیحات کی روشنی میں اسلوب اقبال کا مطالعہ پیش بیان ہے۔ اوّل یہ کہ کیا شعر اقبال کی صرف قرأت سے ہی اقبال کی شناخت ہو جاتی ہے مثلاً ؎

یہ غزل خواہاں ہے پر سوز نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

اگر اقبال کا شعر ہے۔ تو اس میں حیرت کی بات کیا ہے ؟ یہ تو معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی بتا دے گا۔ دوئم یہ کہ اس کلام کی امتیازی اور شناختی پہچان کیا ہے؟ تو بغیر کسی ذہنی کاوش کے کہا جا سکتا ہے کہ جس کلام میں جنون پسند آتشناک طمطراق ہے یقین سے پیدا ضمیر حیات کی پرسوزی اور ملکوتی ادراک سے پیدا پرسوز شعر کی براتی موجود ہو۔ وہ کلام اقبال کا ہے ؎

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک رکھتا نہیں پیوند

اور سوئم تنقیح کا اطلاق اقبال پر نہیں ہوتا، جس میں یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ کلام میں رنگ و روغن اور زور تو بہت ہے لیکن اس میں اسلوب نام کی کوئی چیز نہیں۔ جب یہ کہا جائے گا کہ سردار کی تحریر دلچسپ تو ضرور ہے لیکن اس میں اسلوب نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ تو مرے کے مطابق اس سے یہ مراد کیا جائے گا کہ سردار کے یہاں محض نقطۂ نظر کی تبلیغ کے لئے کلام کا ذریعہ تلاش کیا گیا ہے! جذبات اور واردات قلبی کے ابلاغ کے لئے وجدان و ادراک کی سطح پر ایک جہان دیگر اں کی تصویر کھینچنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس زمرے میں ایک سردار کیا، اقبال کے تمام ناقل، قطع نظر جوش کے، سب نقال کی

حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال اسلوب کے لئے چشم بینا کی مزید شرط لگاتا ہے کیوں کہ جو پردے میں پنہا ہے اس کا ادراک "چشم بینا" سے ہی ممکن ہے۔ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب کے منظر سے نگاہ بے تاب کو عالم تاب اور عالم بیں بنانا، چشم بینا کا اگرچہ معمول ہے لیکن کوئی بازیچہ اطفال نہیں ملاحظہ کیجئے ؎

وہ شعر کی پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ اسرافیل

دراصل اقبال محرم راز درون میخانہ۔ اور اس کا اسلوب مضطرب کا پیغمبرانہ سروش ہے ؎

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفل ملت کو پیغام سروش

اور مرے کی مراد بھی یہی ہے کہ فنکار کا اسلوب تخلیقیت پر دلالت کرے ادب کے حضور جذبۂ تحرک کا نذرانہ پیش کرے اور قاری کو اپنے ساتھ CRISTLIZATION عمل سے گذار دے لیکن اسلوب کا یہ منصب اردو میں صرف اقبال کے جلیل و جمیل شخصیت کے حصہ میں آیا ہے۔ خود اقبال گویا ہیں

؎ مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبال کا پیغمبرانہ نما اسلوب جلیل، جس کے ممتاز عناصر میں سے ایک پاکیزگی بھی ہے، ایک ایسے جلیل، خوش بیان، فصیح انسان کے دماغ کا جوہر بے مثل ہے جو ہر پست اور ذلیل اشیاء سے بالاتر ہے، جس کا لفظ لفظ شوکت عرفان کی تجلیاں بکھیرتا ہے۔ سکنہ اور رعب کی تطہیر کرتا ہے اور طہارت کے مرقعوں سے چھن چھن کر قلب و جگر کو راحت و سکون پہونچاتا ہے۔ یہی نہیں، کلام کے تمام حربوں اور تخلیقی عمل کی تمام تر موشگافیوں کے برتنے کے جتنے عناصر اور لوازمات ہوتے ہیں۔ اسلوب اقبال کی پاکیزہ جلالت کے سامنے صرف

طہارت کے زیر نگیں ہوتے ہیں۔ گویا ان سب کا بنیادی مادہ پاکیزگی ہے۔ یہی پاکیزگی، عقل کی دست و بازو انسانیت کا عنصر اعظم، راستی کا مترجم اور فخر کا تاج ہے۔ وہ اس رتبہ کی چیز ہے کہ ایک پیغمبر اولوالعزم کا معجزہ قرار پائے۔ اسی کا اثر تھا کہ قرآن مجید کے اعجاز نے اعجاز موسوی کو بے حقیقت کر دیا۔ اعصائے موسوی کا معجزہ یہودیوں اور قبطیوں کو غلامی کی حد سے آگے نہ بڑھا سکا۔ لیکن اعجاز قرآنی نے لوگوں کو حضیض خاک سے اٹھا کر آسمان تک پہونچا دیا[1]

وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک
وہ خاک کہ جبرئیل کی ہے جس سے قبا چاک

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

رفعت روح اور پاکیزگی اسلوب کی بابت الانجائنس اپنے مقالہ ON THE SUBLIME کے ۱۳ دیں باب میں تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے اسکا خیال ہے کہ افلاطون ایک خاموش دریا کی طرح بہتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ جاہ جلال اور شان و شوکت حاصل کر لیتا ہے[2] عقیدے کی محکمی اور سیرت کی پختگی و پاکیزگی۔ اس جلالت کے لازمی شرائط ہیں[3] اس پر وہ لوگ کھرے نہیں اتر سکتے جنھوں نے سچائی کی طرف کبھی نہ دیکھا ہو، نہ کبھی بلند اٹھے اور نہ کسی دائمی مسرت سے ہمکنار ہوئے۔ جانوروں کی طرح وہ اپنی نگاہیں زمین پر لگائے جھکے رہتے ہیں اور اپنی چراگاہوں میں چرتے ہوئے موٹے ہوتے ہوئے اور مجامعت کرتے ہوئے اور ان دلچسپیوں کی کم نہ ہونے والی ہوس میں وہ لوہے کے کھروں اور سینگھوں سے ایک دوسرے کو ٹھوکر مارتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے لانجائنس کا مشورہ ہے کہ لوگ پرانی لکیروں کو پیٹتے رہیں کیوں کہ اقبال جیسے تخلیق کاروں کے

---

[1] نظم القرآن و جمہر البلاغہ، مقالات شبلی حصہ دوم صفحہ ۲۴

[2] ارسطو سے ایک ایسٹ تک صفحہ ۱۲۶ [3] انتخاب نمبر علی گڈھ میگزین صفحہ ۳۴۶

مطالعوں سے نقالی بھی جاتی رہتی ہے۔ اقبال جیسے عظیم فنکاروں کی پیغمبرانہ نباتیں، الہامی قوت اور آسمانی جوش کسی سرقہ سے حاصل نہیں جا سکتی۔ بلکہ یہ اوج شکوہ تسخیر تقدیر اور تسخیر فطرت کے ذریعہ بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جو اردو میں صرف اقبال پر افشاں ہوا

حور و فرشتہ ہیں اسیر میری تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھکو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

لوکس کے الفاظ میں، اسلوب اقبال کو الفاظ سے مزین شخصی سیرت کا نام دیا جائے، تو بیجا نہ ہوگا، لوکس نے حسنِ سلوک، حسنِ سیرت اور حسن جذبۂ ایثار کے بیان کو کردار کے بلند میزان پر تولنے کی کوشش کی ہے اسکے مطابق IT IS PERSONALITY CLOTHED IN WORDS, CHARACTER EMBODIED IN SPEECH."

لانجائنس نے بھی کہا تھا کہ اسلوب کی سب سے عظیم کامیابی شخصیت کی بازیافت ہے۔ اقبال یقیناً لوکس اور لانجائنس سے افضل ہیں۔ جو شخصیت کے جوہر کی بازیافت چاہتے ہیں اور شان سکندری کی قصریت کو گدائے بے نوا تصور کرتے ہیں ؎

وجود کیا ہے؟ فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر بے نمود ترا

اور ؎

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے؟
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے؟

ان تفصیلات کے بعد شان و شکوہ کے ایک اور مخرج "صنائع لفظی و معنوی کی موزوں ترین ترتیب" کی طرف مراجعت کرنا مناسب ہوگا! جو بقول، لانجائنس ایک محنت طلب اور ختم نہ ہونے والا کام ہے۔ اس نہ ختم ہونے والی

مشقت آمیز صفت کا پہلا جزو "التجا" ہے۔ جو دراصل ایک نوع کی چیخ، فریاد یا اعلان ہے، اس پکار یا اعلان میں آسمانی جوش و خروش کی حرارت، الہام کا غصب، قوت ایمانی کی لپک اور جدال و قتال کی ہنگامہ خیزی پوشیدہ ہے۔ صنائع کی لفظی و معنوی کی یہ قسم، التجا" صرف نام کی نہیں فریاد ہے، دراصل گریز اور انحراف کی ایک زبردست مثال ہے جس کی طرف ایک "قسم" زمین و آسمان کو تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ لانجائنس ادبیاتِ ڈیمٹریس سے قسم کی ایک مثال اخذ کرتا ہے،

"میں ان لوگوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو جنگ ماراتھان کا حملہ برداشت کر گئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم غلطی پر تھے" اب اقبال کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

اقبال کی فریاد کا ڈیمٹریس کے اعلان سے کسی تقابلی مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن لانجائنس کو ایمان کی قوت، ثبوت کا طمطراق، تاثیر کی نشریت اور تعریف کے جو پہلو مطلوب ہیں ان کا اعلان فریاد اقبال کی فتح میں صاف واضح ہے جو بہر کیف علویت اسلوب کی وجہ سے ہے۔ اقبال کے اسلوب جلیل کی اس فتح مندی میں ایک طرف واحد۔ جمع کی تبدیلی کا فن مضمر ہے تو دوسری فن انطباق (ART OF PARALLELISM) کا آفاقی ہنر اور واحد و جمع کی باہمی تبدیلی کی صفت شدید انانیت کی بے مثل انفرادیت کے سبب ظہور پذیر ہوتی ہے۔ مضمون کی وسعت، جذبہ کی شدت اور تاثر کی تیزی جمع کو واحد اور واحد کو جمع میں تبدیل کر دیتی ہے۔ مثلاً

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
نہایت اسکی حسین، ابتدا ہے اسمٰعیل یا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی ہیں قومیں۔ جہاں الفاظ واحد ہوتے ہیں وہاں ان کے جمع کرنے کا عمل احساس میں غیر معمولی تاثر پیدا کرتا ہے اور بات کی

عظمت کو آفاقیت کی بلندیوں سے بلند نہ جانے کہاں پہنچا دیتا ہے ؎

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

واحد جمع کے باہمراہ تبدیلی کی طرف زمانہ (TENSE) کی تبدیلی بھی اسلوب جلیل کا ایک عنصر ہے ، جو اقبال کا مرغوب آلہ کار ہے اور "تسخیر زمانہ" کا دعویٰ دراصل اقبال کو ہی زیب دیتا ہے ۔ اقبال کو "شاعر فردا" کہا گیا اور اقبال کو ہی "عہد ماضی" کا سب سے بڑا نقیب بنایا گیا اور ساتھ ہی اقبال کو عہد رفتہ کی عالمی ادبی بساط پر اعیار کے مقابل بھی رکھا گیا ۔ یہاں اقبال کے ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں ملاحظہ کیجیے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

جہاں تک فن انطباق ART OF PARALLELISM کے تناظر میں اقبال کے اسلوب جلیل کا مقصود ہے تو شاید اردو داں بھی اس تکنیک سے واقف نہیں ہے لیکن اقبال کا فن ہر نوع کے حجابات طلسم کے پردے کب کا چاک کر چکا ہے ۔ اسکا مقام ہر مقام سے آگے ہے کیوں کہ زندگی ۔ ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں ہے ۔ لہٰذا اقبال سے کس کا اور کیسا حجاب ؟ .

عروس لالہ ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ نہیں اور

یا ــ عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں ! میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

انطباق (PARALLELISM) سے مراد ہے کہ کسی تخلیق میں پہلو بہ پہلو متوازی اور مختلف موضوعی اور لسانی اکائیوں کا پس بیان اور پیش بیان تکنیک کے ذریعہ استعمال ۔

فنکار جو کچھ بیان کرنا چاہتا ہے ۔ اس کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے ایک فضا کا تیار کرنا لازمی ہے اور اس پیش بند فضا کو اپنے مکمل موضوعی اور معروضی

ماحول کے ساتھ پردۂ تخلیق کے حجابات اٹھانا، پیش بیانی FOREGROUNDING ہے
اقبال کے یہاں پیش بیانی سے لے کر پیش بیان تک کا عمل نہایت خلاقانہ شعری توازن کے ساتھ ظہور پزیر ہوا ہے۔ فن انطباق کی گنجلک اصطلاحوں میں نہ جاکر مثالوں کے ذریعہ اقبال کے اسلوب جلیل کی شناخت محل بیان ہے۔ ادبیات اقبال میں فن انطباق کا استعمال مندرجہ ذیل طریقوں سے ممکن ہے۔

(الف) لسانی اور موضوعی اکائیوں میں اتفاق یا اختلاف کی بنیاد پر انطباق کے مندرجہ ذیل طریق کار اقبال کے یہاں دستیاب ہیں۔

اول ایک طرح کی اکائیوں (لسانی یا موضوعی) میں یکسانیت اور اتفاق پیدا کر کے تطبیق پیدا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اقبال کی نظم مسجد قرطبہ کے پہلے بند کو دیکھئے بمشکل تمام ہر کاری اور معکوسی آوازوں کی کل تعداد صرف پانچ ہے۔ اسی طرح دوسرے میں دو اور تیسرے میں ۳ اور یہی حالت آگے کے بندوں میں بھی موجود ہے۔ اور اسی طرح پہلے بندوں میں وقت، دوسرے میں عشق اور تیسرے میں معجزہ فن سے خون جگر کی نمود وغیرہ کا ذکر ہے۔ اسی مضمون کو وسعت دیجئے تو ایک تحقیقی مقالہ بن سکتا ہے اور کچھ لوگوں نے بنایا ہے لیکن بنیادی امر یہ ہے کہ کیا شروع تا آخر اسلوب جلیل موجود ہے۔ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلوب جلیل کے نزدیک ہکاری اور معکوسی آوازیں معیوب اور مبتذل ہیں۔ یہی وجہ کہ ایک نظم، مسجد قرطبہ منتخب شعریات کیا؟
مکمل ادبیات اقبال کے اسلوبیاتی مطالعہ کے تناظر میں، اسی طرح کے یکساں اور متفق اکائیوں کی نظیر موجود ہے، جو اسلوب جلیل کی شعلہ آگیں حرارت کو مجروح نہیں کرتی بلکہ اس میں خوب سے خوب اضافہ کرتی ہے۔

دوئم۔ مختلف اکائیوں کو متوازن کر کے ان میں انطباق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہکاری اور معکوسی آوازوں کا ارتکاز کمال جلالت کی نمود پیدا کرنے کے لئے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ممکنات میں سے ایک ہے؟ صرف

اقبال کے اسلوب جلیل کا عمل تطہیر ہے کہ اس کی بنا پر بیکاری اور معکوسی آواز بھی عالم امکان میں آکر فصیح، بلیغ اور پر شکوہ شکل اختیار کر لیتی ہیں صرف چند مصرعے پیش نظر ہیں۔

ع آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی

ع گوشۂ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب

ع دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خضر

ع آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر

ع جس سے دکھاتی ذات زیر و بم ممکنات

ع تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے ؟

اور اسی طرح متضاد موضوعی اکائیوں میں اقبال کے یہاں توازن کی ندیاں رواں ہیں۔ صرف چند نظموں کے عنوانات دیکھئے عقل و دل، عشق اور موت، زہد اور رندی، حسن و عشق، چاند اور تارے، کفر و اسلام، میں اور تو، زمین و آسمان، علم و عشق، شکوہ و شکایت، علم اور دین، کافر اور مومن، فقر و راہبی، لا اِلہ، جلال و جمال، دین و سیاست، جبریل و ابلیس، حال و مقام، چیونٹی اور عقاب، وغیرہ وغیرہ، غرض کہ دوئم نکتہ پر بھی ایک مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔

سوئم۔ یکساں اکائیوں اور مختلف اکائیوں کے امتزاج کو متوازی کر کے انطباق کی ایک تیسری شکل پیدا کی جا سکتی ہے۔ امتزاجی تطبیق MIXED PARALLELISM اگرچہ بے حد پیچیدہ اور گنجلک پسند صورت انطباق ہے تاہم اقبال کے اسلوب سے اس کی زندہ اور جاوداں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسلوب جلیل کے تیغ فساں پر اشعار کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

گاہ میری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

؎ روزِ حساب میں جب مرا پیش ہو دفترِ عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اور اسی طرح بے شمار اشعار منتخب کئے جا سکتے ہیں۔ اور اسی مضمون کو وسعت دے کر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

موضوعی اکائیوں میں جذباتی، فکری، واقعاتی یا تاریخی عنونات وغیرہ کا انطباق اور اسی طرح لسانی اکائیوں میں صرفی اور نحوی انطباق کی صورتوں کو بیان کر کے اقبال کے اسلوبیاتی مطالعہ کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلوبیاتی تنقید STYLISTIC CRITICISM کے پیشِ نظر لسانی اکائیوں کے انطباق کی چند قباحتیں ہیں، جو اقبال کے اسلوبِ جلیل کی تشکیل میں کس حد تک دخیل ہیں قابلِ مطالعہ ہیں۔

(۱) شاعری میں لسانیاتی تجزیے کا اطلاق اسی وقت ممکن ہے جب یہ فرض کر لیا جائے کی شاعری ایک کی طرح صرف زبان ہے اور ہر اس چیز کو نظر انداز کر دیں جو اس کے علاوہ کبھی شاعری میں ہو۔

(۲) نحوی اور صرفی تجزیے ایک طرف ادب کی جمالیاتی اقدار سے ایک حد تک علاقہ نہیں رکھتے تو دوسری طرف یہ تجزیے قطعیت اور معروضیت کی ایسی فضا قائم کرتے ہیں کہ اسلوبیاتی تنقید کا وجدانی پہلو بالکل پامال ہو جاتا ہے۔

(۳) لسانیاتی مطالعہ نیز خصوصیات نحویات اور صرفیات کے مدِ نظر، قواعد اور قاعدوں کے حوالے سے زبان کے بیوہار کے ضمن میں پیشین گویاں کرنا اور اسلوبیاتی تنقید میں CLASSIFICATION کرنا اور پھر کچھ اور حربے کا سلسلہ شروع کرنا غرضکہ ایسی چستیاں تیار کرنا کہ آپ سمجھے یا خدا ہی سمجھے۔

(۴) لسانیاتی تجزیوں میں اسلوبیاتی تنقید کئی معنوں میں محدود ہو جاتی ہے اور بہت سی قائم شدہ اصطلاحوں اور تعریفوں کی از سرِ نو تفہیم کی متقاضی ہوگی۔ اور بعض ایسے نکات پیدا ہو جائیں گے جن کو لسانیاتی نقاد اسلوبیاتی مطالعہ میں اٹھانے کی زحمت ہی گوارا نہ کرے۔ مثال کے طور پر ذاتی علامتیں، طنز کی تپش اور روایات سے انحراف کرتے ہوئے شاعری کا کوئی اور تجربہ اور ذاتی کرب۔ اور تخلیقی عمل کے

دیگر عوامل۔ لیکن ان تمام مباحثوں کے بعد اقبال کے اسلوب جلیل کی شان و شکوہ ملاحظہ کیجئے کہ محدود سے محدود معیار جیسا کہ بعض علماء نے لسانیات بلکہ فقط صرف و نحو کی بنیاد پر تجزیے کئے ہیں لیکن اقبال کے شان اسلوب میں کہیں فرق نہیں پڑتا، یہ کرامت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اسی طرح اسلوبیاتی مطالعہ کا وسیع سے وسیع تر معیار بنا لیجئے لیکن اقبال کا اسلوب جلیل کا رعب پوری شان سے قائم رہتا ہے۔ جیسا کہ اس مطالعہ کا مقصود ہے۔

(ب) غیر حاضر یا غیر موجود امور یا اشیا میں فن تطبیق کی تفہیم اقبال کے اسلوب جلیل کے مطالعہ کے پیش نظر، اردو میں پہلی دفعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اس نوع کے انطباق کے بیان سے قبل، اس کے چند عناصر کی تشریح ضروری ہے۔

اوّل۔ وہ چیز جس کا بیان کیا جائے یا موجود ہو یا جو مرتکب فعل ہو، اسے فاعل، حاضر موجود یا متحرک کہتے ہیں۔ جیسے اقبالیات کے مطالعہ کے پیش نظر، مسجد قرطبہ، کوکب، خون جگر، جبرئیل اور اسرافیل وغیرہ۔

دوئم۔ وہ چیز جس کا بیان تو کیا جائے لیکن موجود و حاضر نہ ہو، غیر حاضر یا غیر موجود سے عبارت ہے جیسے شاہین ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام فرشتوں کا گیت، ابلیس کی مجلس شوریٰ، ہاتھ ہے اللہ کا یا خدا کی آواز انھیں دونوں عناصر یعنی حاضر کو غیر حاضر اشیا اور غیر موجود اشیا کو موجود اشیا پر منطبق کر کے نہایت عمدہ توازن پیدا کیا جا سکتا ہے جو بہر کیف ایک بہترین اسلوبیاتی عمل ہے مثال کے طور پر ہے "میری جرأت سے مشت خاک میں ذوق و نمو" میں شیطان کی حوصلہ مندیوں کا رشتہ انسان کی ذوق و نمو سے جوڑا گیا ہے۔ یہی نہیں نظم، جبرئیل و ابلیس، کی مکمل ساخت کا بغور مطالعہ کر جایئے، شروع تا آخر فن انطباق کی ایسی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے، نیز رعب، شکوہ، سکتہ اور پاکیزگی کی شان بھی بحال رکھی گئی دیدنی ہے ایک خیالی گفتگو کو جنگ و امن کا رزم نامہ عنوان دینا، اسلوب جلیل ہی کا کام ہے ساتھ میں اسلوبیاتی مطالعہ کے پیش نظر یہ امر بھی دیدنی ہے کہ جو عالم کن و فیکون میں کبھی واقع نہیں ہوا وہ اقبال کے پر شکوہ اسلوب بیان کی گرفت میں ہے

کے چند مصرعے پر اکتفا کرتے ہوئے فن انطباق کے چند مظاہر ملاحظہ کیجئے:

جبرئیل: ہمدم دیرینہ! کیسا ہے جہان رنگ و بو؟

ابلیس: سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

ابلیس: کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اسکے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

جبرئیل: کھو دئے انکار سے تو نے مقامات بلند

ابلیس: ہے میری جرأت سے مشت خاک میں ذوق نمو

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کیسا لہو؟

اس طرح سے آپ تمام اقبالیات کا مطالعہ کرتے چلے جائیے۔ جہاں بھی حاضر کو غیر حاضر سے اور موجود کو غیر موجود اشیاء سے متوازن کرنے کا رجحان دکھائی دیگا بے شبہہ وہاں ایک شکوہ بے مثل کی نمود بھی جلوہ فروزاں ہوگی۔ مثال کے طور پر مکالمہ جبرئیل و ابلیس کے بعد اذاں، قطعہ، محبت، ستارہ کا پیغام، جاوید کے نام، فلسفہ و مذہب وغیرہ تخلیقات ہیں۔ یہاں سے بھی صرف ایک ایک مصرعہ دیکھئے اور دیکھتے جائیے۔

اذان: اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پر اسرار

قطعہ: دین و مذہب مردان خود گاہ و خدا مست

محبت: شہید محبت کافر و نمازی

ستارہ کا پیغام: مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی

جاوید کے نام: مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

فلسفہ و مذہب : اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں

حافر کو حافر سے اور حافر کو غیر حافر سے انطباق کی مذکورہ بالا صورتیں، کلام اقبال کے اسلوبیاتی مطالعہ کے مدنظر اتنی ضروری بحث ہے کہ جتنی خود شخصیت اقبال کی متحرک جلالت، جو خون میں آکسیجن کی طرح داخل ہے۔ لیکن بغیر تجزیہ کے صاف دیکھائی نہیں دیتی۔

بالکل اسی طرح حافر کو حافر سے اور غیر حافر کو غیر حافر اشیاء (آکسیجن کی طرح) سے انطباق کا عام رجحان کلام اقبال میں نمایاں ہے۔ فن انطباق کے اس تکنیک کے پیش نظر، اقبالیات میں پرشکوہ تطبیق کی مندرجہ ذیل صورتیں عام طور پر دیکھی جا سکتی ہیں :۔

اوّل۔ کسی شکل کو دوسری شکل پر منطبق کرنا مثلاً

(۱) ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے ؟ ذوق انقلاب

یا (۲) ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور

دوئم۔ ایک پیکر کو دوسرا پیکر پر منطبق کرنا مثلاً

جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن ریب !

سوئم : کسی تاثر کو دوسرے تاثر پر منطبق کرنا مثلاً

کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق

چہارم : کسی قدر کو دوسری قدر پر منطبق کرنا مثلاً

جس میں نہ انقلاب ، موت ہے وہ زندگی

پنجم : کسی فعل کو دوسرے فعل (یا افعال) پر منطبق کرنا مثلاً

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ

(ج) استعمال یا محل بیان کے اعتبار سے اسلوبیات اقبال میں حاضر اشیاء کا انطباق مندرجہ ذیل طریق کار سے ہوا ہے جس کا ایک اندازہ پیش بیان ہے۔

۱۔ صفت کی صورت میں مثلاً۔ پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

۲۔ صفت اندر صفت کی صورت مثلاً ۔ آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے

۳۔ تلمیح کی صورت میں مثلاً ۔ کشتی مسکیں وجان پاک و دیوار یتیم

۴۔ فعل کی صورت میں مثلاً چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد

۵۔ فعل صفت صورت میں مثلاً گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل

۶۔ مکالمہ کی صورت میں مثلاً کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے

۷۔ امیجری کی صورت میں مثلاً ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

۸۔ تصورات محض کی صورت میں مثلاً یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل

۹۔ تزئین بیان کی صورت میں یا ایک ہی مضمون کو مختلف الفاظ میں پیش کرنے کی صورت میں مثلاً اسلوبیات اقبال کے پیش نظر عشق کے بیان کی تطبیق کی چند صورتیں ملاحظہ کیجئے :۔

۱۔ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

۲۔ نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے

۳۔ کبھی آوارہ و بے خانماں عشق

۴۔ کبھی عریاں و بے تیغ و سنان عشق

۴۔ کبھی تنہائی و کوہ و دمن عشق

۵۔ کبھی سوز و سرور و انجمن عشق

۶۔ کبھی مولد علے خیبر شکن عشق

۷۔ شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام

۸۔ عشق کے خورشید سے شام اجل شرمندہ ہے

۹۔ عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی

۱۰۔ عشق طینت میں فرد مایہ نہیں مثل ہوس

۱۱۔ نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں

۱۲۔ میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن

۱۳۔ عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں

۱۴۔ وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک

۱۵۔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

۱۶۔ عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

۱۷۔ عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

۱۸۔ عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہ تصورات

۱۹۔ بے جرأت رندانہ ہر عشق ہے روباہی

۲۰۔ اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

۲۱۔ عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب

۲۲۔ صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق

۲۳۔ معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یہاں مسجد قرطبہ کے اشعار سے قطع نظر، عشق کے محض چند مظاہر کی انطباقی کارروائیوں کا صرف ایک اندازہ پیش کیا گیا جس سے یہ دریافت کرنا کہ ع

عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

زیادہ مشکل مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ ظاہر ہے یہ طرز کلام، اسلوب جلیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جو عشق کی تطبیق کی نہ جانے کتنی صورتوں کا تخلیق کار ہے، جس سے گھبرا کر کلیم الدین احمد جیسے قاہر ناقد بھی ماؤف ہو چلے تھے۔

(۱۰) اسماء کی صورت میں انطباق کی دو صورتیں کلام اقبال میں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں۔

(الف) اسم معرفہ کی صورت میں چند مثالیں صرف ایک تخلیق ذوق و شوق سے ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ آئی صدائے جبریل۔ تیرا مقام ہے یہی

۲۔ کیا نہیں غزنوی کارگہ حیات میں

۳۔ قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
۴۔ شوکت سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
۵۔ فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
۶ عشق تمام مصطفےٰ! عقل تمام بولہب

(ب) اسم نکرہ کے انطباق کی چند صورتیں اسی نظم سے دیکھئے:۔

۱۔ آیہ کائنات کا معنی دیریاب تو
۲۔ لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
۳۔ عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
۴۔ ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
۵۔ تیری نظر میں ہیں تمام، میرے گذشتہ روز و شب
۶۔ میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
۷۔ میری تمام جستجو کھوئے ہوؤں کی جستجو

(ج) اسم معرفہ اور اسم نکرہ کے امتزاج کی خوبصورت تطبیق بھی کلام اقبال میں مکمل شکوہ کے ساتھ جلوہ گر ہے اس کی بھی چند مثالیں بغیر کسی عمیق مطالعہ کے ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ دیکھتا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیمان خضر
۲۔ کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل
۳۔ علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
۴۔ وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
۵۔ سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
۶۔ توڑ دیتا کوئی موسیٰ طلسم سامری

(د) تمثیل کے ذریعہ بھی غیر حاضر اشیاء کا انطباق کلام اقبال کے اسلوبیاتی مطالعہ کے پیش نظر دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک شعر دیکھئے ؎

نسل، قومیں، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکراتی

(۱۲) علامت کی صورت میں غیر حافر اشیاء کا انطباق شاہین، خضر، گردوں، فقر، غنچہ، کرمک ناداں، کرگس، عروس لالہ بہار، خاک، شعلہ، مرغ چمن، ملت بیضا، انگارہ خاکی، بال و پر روح الامیں، خاکی ہو کہ نوری ہو، لہو خورشید کا ٹپکے، خون شفق، غبار رہگذر، بجلیاں، ندیاں، یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ نکلے، رازکن فکاں، خودی کا رازداں، شرمندہ ساحل وغیرہ۔ ساتھ ہی یہ ملحوظ مطالعہ رہے کہ اقبال کے بعض تخلیقات کو علامتی مطالعہ کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خود اقبال کے اسلوب جلیل کی شاہکار نظم، مسجد قرطبہ کو بھی بعض علمائے تنقید نے ایک علامتی تخلیقی شاہکار قرار دیا ہے۔

(۱۳) ضرب المثال اور محاورے کی صورت میں غیر حافر اشیاء کا انطباق اقبالیات میں جگہ جگہ موجود ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اسلوب جلیل کے نزدیک محاورہ کا استعمال مبتذل فعل ہے اور ضرب المثال کا استعمال مستحسن۔ غرض اس نکتہ کے پیش نظر، اقبالیات سے محاورہ کا انطباق ڈھونڈھ نکالا بے حد گنجلک کام ہے۔ اگر مکمل کلیات اقبال کو کمپیوٹر کی یادداشت کے حوالے کر دیا جائے تو شاید ہی دو چار محاورے نکل آویں۔ اس احتمال شدید کو سامنے رکھتے ہوئے ضرب المثال کی مثالوں پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ خضر راہ سے چند مثالیں:

۱۔ جیسے گہوارہ میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
۲۔ آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے
۳۔ جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی
۴۔ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے

۵۔ حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

(د) غیر حاضر اشیاء کا انطباق چند دوسرے طریق کار کی مدد سے بھی اسلوب اقبال کے مطالعہ کے دوران بآسانی دیکھا جا سکتا ہے، جس کی تفصیل کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہیں :

(الف) مرئی اور غیر مرئی کی بنیاد پر انطباق کے لوازمات کا اہتمام کرنا۔ جس کی چار صورتیں اسلوبیات اقبال میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔

۱۔ مرئی اشیاء کے لئے مرئی اشیاء کا انطباق مثلاً
تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے۔

۲۔ مرئی اشیاء کے لئے غیر مرئی اشیاء کا انطباق مثلاً
ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

۳۔ یا غیر مرئی کے لئے غیر مرئی اشیاء کا انطباق مثلاً
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا۔

۴۔ غیر مرئی کے لئے غیر مرئی کے اشیاء کا انطباق مثلاً
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا

(ب) طوالت اور اختصار کی بنیاد پر انطباق کی دو صورتیں اسلوب اقبال کے ضمن میں قابل مطالعہ ہیں۔

(۱) کلیات اقبال کا بغور مطالعہ کیجئے تو اکثر غیر حاضر اشیاء اپنی لسانی صورت میں بے حد مختصر معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر خون، شاہین، جگر، عشق، خاک، آئینہ، چاند، زندگی وغیرہ لیکن کبھی کبھی زور اور شکوہ کی شدت اضافہ میں کرنے کے لئے یہ لسانی اکائیاں طویل بھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ساحل دریا، انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب، مانند سحر رنگ شباب، آب زندگی، نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل وغیرہ۔

۲۔ فن اضافت اور الفاظ کے جوڑوں اور مختلف نوع کی صنعتوں کی مدد

سے انطباق کا فن اسلوب اقبال میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے

گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
خاک مشرق پر چمک جا کے مثال آفتاب
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر

موضوع کی بنیاد پر انطباق کی صورتوں کا مطالعہ خاصا اہم ہے۔ اقبال کے اسلوب جلیل کی نصف قوت کا سرچشمہ اس کے موضوعات کے رہین منت ہے کلیات اقبال میں چند نظموں کی محض سرخیوں کو ملاحظہ کیجئے۔ گل رنگیں، ابر کوہسار، آفتاب، گل پژمردہ، موج دریا، نالۂ فراق، جگنو، داغ، ابر، بلبل، تنہائی، فراق، ستارہ، چاند، سیر فلک، شعاع آفتاب، پھول، بیں اور تو، زندگی، سلطنت، سرمایۂ محنت، صبح، زمین، آسمان، جہاد، مستی کردار، اے روح محمد! فقر و راہبی، جان و تن، نبوت، آدم آزادی، لاالہ، موت، قم باذن اللہ، حکومت، تخلیق، جنون، سرور، جلال و جمال، سرود جلال، انقلاب، غلاموں کے مسولینی، اذان، فقر، خودی، جدائی، لہو، پرواز، شاہین وغیرہ بالفرض ان عنوانات کو اصطلاحی الفاظ تسلیم کر لیا جائے تو اقبال کے اسلوب جلیل کی کچھ تشریح کیا جا سکتی ہے دراصل انھیں موضوعات کی گونج اقبالیات کے مطالعہ کے دوران مختلف الفاظ و خیال کی شکل میں سنائی دیتی ہے۔ لیکن اسلوب کا طریق کار جلیل و جمیل ہی رہتا ہے۔ اس کے لئے زمین و زماں، مکین و مکاں، فطرت و آسماں، بندہ و معبود، مذہب و توہم، منطق و فلسفہ، طنز و ظرافت، تاریخ و تنقید، اور دیگر علوم انسانی کی امکانی صورتوں کے مظاہر بھی اسلوب اقبال کے قن انطباق میں جلوہ گر ہے، جس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔

(د) قابل نفریں اور ناپسند اشیاء کی بنیاد پر بھی اقبال نے انطباق کے مظاہرے پیش کئے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ قابل نفریں اشیاء

اقبال کے اسلوب جلیل کے پیرایہ میں آکر جلیل و جمیل پیکروں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ریا، گندگی، بدکاری، سود، محکومی، غلامی، ناامیدی، محرومی، چوری، رندی وغیرہ اور مکر، مکھی، گلہری، خچر، چیونٹی، کیڑا وغیرہ کا مکمل مشاقی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور ابتذال کی ذرا سی بو بھی نہیں آنے دی۔ چند الفاظ اور ان کے انطباق کے ساتھ اسلوب جلیل کی جزالت کا رنگ ملاحظہ کیجئے یہ کہ دل تجزیاتی عمل سے کنارہ کش ہو کر تاثراتی ہو جاتا ہے۔

ایک لفظ "مردہ" کا استعمال،

؎ وہ مردہ کہ تھا بانگ سرافیل کا محتاج

؎ خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

(۴) قدیم اور جدید کی بنیاد پر انطباق کی مثالیں اقبال کے اسلوب جلیل کے پیرائے میں ملاحظہ کیجئے۔

(۱) یہ سیہ پوشی کی تیاری کس کے غم میں ہے
محفلِ قدرت خورشید کے ماتم میں ہے

(۲) باغ ہے فردوس ہے یا اک منزلِ آرام ہے؟
یار خ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے؟

(۳) جگایا بلبل رنگیں نوا کو آشیانے میں
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا

یہ مثالیں بانگ درا حصہ اول جو اقبال کا ابتدائی کلام سے ماخوذ ہیں، لیکن آپ نے ملاحظہ کیا کہ اقبال کے پرشکوہ لہجہ میں کہیں بھی کمی نہیں۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے لہجہ کی بلند آہنگ گونج اتنی شدید اور زبردست ہے کہ اسلوبیاتی مطالعہ بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ بلند آہنگ گونج کی شناخت ایک تو اقبال کے پرشکوہ ایجاز کے سبب ہے اور دوسرے شوکت الفاظ کا انتخاب ہے۔ اور پھر الفاظ کا مقتضائے حال کے مطابق مانوس استعمال۔

سوئفٹ کا خیال ہے کہ اسلوب مناسب سیاق وسباق میں مناسب الفاظ کا انتخاب[1] ہے۔ اور پیٹر الفاظ کی مانوسیت کو بھی اسلوب کی تشکیل کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں[2] مرے روح اسلوب ایجاز نگاری میں قرار دیتے ہیں[3] تو لوکس ایجاز کا رشتہ قوت وشوکت اور برقیت سے جوڑ رہتے ہیں[4] ظاہر ہے کہ یہ سب اقبال کے اسلوب جلیل کے عناصر ترکیبی میں سے ہی چند اجزا ہیں۔ جن کا انطباق پوری بلاغت کے ساتھ کلام اقبال میں موجود ہے۔

فن انطباق کے معیار پر اقبال کے اسلوب جلیل کا ایک نشان امتیاز (STYLE MARKER) ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ دراصل اس لسانی، موضوعی اور معروضی اکائیاں جن کو اسلوبیاتی عمل میں ایک خاص کردار ادا کرنا ہوتا ہے، اسکو سٹائل مارکر سے موسوم کی جاتی ہیں۔ سٹائل مارکر جملہ سیاق وسباق سے متعلق ہوتا ہے۔ جس میں تخلیق کار کا ذاتی تجربہ، شعری صناعی کا اہتمام، ریاضت و انہماک اور خون جگر کے امتزاج کا رنگ بے مثل شامل ہوتا ہے۔ اقبال کے یہاں بالکل نمایاں ہے۔ انجوسٹ کے لفظوں میں "سیاق وسباق کے ایک ہی گروپ میں زیادہ یا کم مستعمل لسانی اکائیاں اسٹائل مارکر کہلاتی ہیں[5]۔

1) "PROPER WORDS IN PROPER PLACE IS THE TRUE DEFINITION OF A. STYLE."

2) "WORDS STILL IN USE."

3) "FOR STYLE WHOLLY DEPENDS UPON THIS PRECISE COMMUNICATIONS, WHERE IS NOT, STYLE DOES NOT EXITS."

4) "BREVITY CAN GIVE GRACE, IT CAN GIVE FORCE BUT IT CAN GIVE. ALSO RAPIDITY."

5) LINGUISTIC AND STYLE P. 35

گویا اسکائل مارکر سیاق وسباق سے متعلق لسانی عنصر ہیں اور وہ عناصر جو اسکائل مارکر نہیں ہیں، اسلوبیات کے نقطۂ نظر سے بے ضرر یا معصوم ( ) کہے جائیں گے، کچھ لسانی اکائیاں بھی سیاق وسباق میں دخیل ہیں جن کو صفر ( ) سیاق وسباق میں رکھا جاتا ہے۔

اسٹائل مارکر کے مطالعہ میں لسانی اکائیوں کو کمپوٹر کے حوالے کرکے، ان کے سیاق وسباق کے ضمن میں ان کی تقسیم وتجزیہ کا کام کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ بعض علماء نے اسلوب اقبال کے مطالعہ میں کیا ہے حالانکہ انھوں نے اسکائل مارکر کی واضح اصطلاح استعمال نہ کرسکے نہ جانے کیا کیا لسانی داؤں پیچ سے کام لیا ہے۔ اقبال کے اسلوب کا اسکائل مارکر لفظ "جلالت" یا کیفیت جلال میں مضمر ہے۔

اسکائل مارکر کے تعین کا مسئلہ اتنا آسان نہیں کہ یوں نگاہ دوڑی اور یوں بجلی چمکی۔ بلکہ کافی گنجلک اور پیچیدہ معاملہ ہے۔ اینکوسٹ بھی اس نزاکت سے واقف تھا۔ اسی لئے اس نے اسٹائل مارکر کی شناخت میں تقسیم کو بہت اہم قرار دیا۔ تقسیم سے مراد ہے کہ وہ نشان امتیاز کس پس منظر میں آیا ہے۔ تقسیم کو اینکوسٹ کی ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مسٹر اور مسز "الف" برسات کے ایک دن آگ کے پاس بیٹھے ہیں؛ مسٹر الف کہتے ہیں کتنا خراب دن ہے" مسٹر الف کا بیان جس سیاق وسباق میں ہے۔ وہ ہے ان کا گھر آگ کے پاس برسات کے دن، شوہر کا بیوی سے مکالمہ۔ مسٹر الف کا بیان کس سطح پر اسٹائل مارکر ہے، قابل مطالعہ چیز ہے۔ لیکن اگر مسٹر زید برسات کے تعریف میں چند فقرے کہتے ہیں تو ان کے مقابلہ میں مسٹر الف کا مذکورہ بیان اسٹائل مارکر بن سکتا تھا۔ اور اسی طرح سے اس نوع کے بیان کا اطلاق اگر کسی سماج کے لئے ہو تو وہ ایک سماجی اسٹائل مارکر بن سکتا ہے اور یہ چیز دیگر لوگوں کے مقابلہ میں مسٹر الف کی انفرادیت بھی ہوسکتی ہے۔ مگر اصلاً یہ لسانی امتیاز اجتماعیت

کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ فرد کی مسلم انفرادیت کیلئے تو اقبال جیسا اسٹائل مارکر درکار ہے جس کی شناخت خون آتش سوزاں کے سبب ہر کس کے لئے آسان کام ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودا کے خام خونِ جگر کے بغیر

اجتماعی اثر و قبول سے کبھی کبھی ایسے حالات بھی نمودار ہو سکتے ہیں، کہ تخلیق کار کے اسلوب کی شناخت ناممکن العمل ثابت ہو سکتی ہے۔ اینکوسٹ کے مطابق وہ تخلیقات جو ایک ہی طرح کے اسالیب مجموعوں (سیٹ) کے مارکر کا استعمال کرتی ہیں، ایک ہی اسلوب کے ذیل میں آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی عہد کے دو یا دو سے زیادہ تخلیق کار کی تحریروں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے اسٹائل مارکر یکساں ہوتے ہیں اور وہ ایک ہی طرح کے سیٹ سیاق و سباق کی سطح پر تشکیل دیتے ہیں، جیسا کہ اقبال کے بعد ان کے نقالوں نے خوشہ چینی کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن نقال کے نقال رہے، ناقل بھی نہ بن سکے۔ اسی لئے اسلوبیاتی مطالعہ میں سیٹ یا ہم شکل صورتوں کے تقابل

COLOCATION & SET کا نظریہ بھی ہمیشہ قابل مطالعہ رہا ہے۔

اقبال کے اسلوبیاتی مطالعہ کے ضمن میں سیٹ کے نظریہ THEORY OF SET کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ سیٹ کے آلہ کار TOOLS OF SET سے بھی اسلوب جلیل کی شناخت کا کام نہایت آسانی سے انجام پا سکتا ہے۔ لفظوں کے اجتماع اور لسانی اکائیوں میں سیٹ کی تکنیک بے حد کارگر ہوتی ہے۔ قواعد کے پیش نظر، ایم۔ اے۔ کے۔ ہیلڈے نے سیٹ کے مطالعہ کے ضمن میں چار اصولی درجوں CATOGORIES کا تعین کیا ہے، جس کا امکانی اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

(۱) اکائی　　UNIT

(۲) ڈھانچہ یا ساخت　　STRUCTURE

(۳) درجہ　　CLASS

(۴) تنظیم یا نظام　　SYSTEM

ان مقررہ اصولوں کی روشنی میں دیکھنا ہوگا کہ تخلیق کار کس زبان

میں اپنا مافی الضمیر پیش کرتا ہے۔ ہر زبان کی اپنی اکائی۔ ساخت، درجہ اور تنظیم ہوتی ہے۔ اور اسکی اکائیوں کی تنظیم، تنظیم کی ساخت اور ساخت کے درجات بھی ہوتے ہیں، یہ عمل کافی دلچسپ ہے۔ اور اس کو زنجیر نما تعلق (CHAIN - RELATION) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کا یہ مصرعہ دیکھئے:

پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا؟

دلچسپ بات ہے کہ اس مصرعہ میں پیکر نور، اور سجدہ وغیرہ نہایت نازک اور جمیل لسانی اکائیوں کا استعمال ہوا ہے لیکن کیا اس کے استعمال سے مصرعہ کو ایسی ساخت میسر آئی ہے۔ کہ مصرعہ درجۂ جلیل پر خود بخود فائز ہو جاتا ہے۔ اس مصرعہ کی پوری تنظیم میں "کیا" مطالبہ کرتا ہے کہ شاعر یہ بھی لکھے ؎

اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود!

اور یہی اقبال کے اسلوب جلیل کا کارنامہ ہے کہ لسانی اکائیوں کی تنظیم میں نور جلالت کی چمک ایک شعلہ کی طرح ہر جا جلوہ گر ہے، ہلیڈے نے اس کام کے لئے تین پیمانے دئے ہیں رینک (RANK) ڈیلی کیسی (DELICACY) اور ایکسپونینس (EXPONENCE) اس کے مطابق رینک پیمانہ میں پانچ اکائیوں کا مطالعہ ہوتا ہے (۱) جملہ یا فقرہ (SENTENCE) (۲) ملحق جملہ (SUB SENTENCE) (۳) اجتماع (۴) لفظ (۵) حرف۔ گویا ایک جملے میں کئی ملحق جملے، ایک جملۂ ملحقہ میں کئی اجتماع، ایک اجتماع میں کئی الفاظ اور ایک لفظ میں کئی حروف ہو سکتے ہیں عموماً ملحق جملہ کی ساخت کے مقابلہ میں مکمل جملہ کمزور ہوتا ہے۔ جب کہ اجتماع ملحق کے اور لفظ، ملحق کے مقابلہ میں، اسی ملحق جملہ کی ساخت جب گھٹتی ہوئی نہیں ہوتی ہے یا زنجیر نما نہیں ہوتی ہے تو اسے رینک شیفٹنگ (RANK SHIFTING) کہتے ہیں۔ اسی طرح جب اجتماع الفاظ ملحق جملہ سے آزاد ہو جاتا ہے تو اسے بھی متغیر کلاس سے عبارت کرتے ہیں۔ فری مین کے الفاظ دیدنی ہیں۔

-

CLAUSES WHICH DONOT FROM CRE TE ELEMENT OF THE STRUCTURES OF SENTEN -CE ARE CALLED RANK SHIFTING CLAU SES." (dinguistic & Lit. Style P.131)

جمال انگیز تجزیاتی نگاہ یا ڈیلی کیسی وہ عمیق تجزیاتی پیمانہ ہے جس میں جملہ کی ساخت کے ظاہر و باطن کے حسن کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے EXPONENCE میں متغیر کلاس کی مختلف سطحوں کو عمومی رنگ میں لسانی تعلق سے جوڑا جاتا ہے۔ ازسرنو زندہ اظہار یا EXPONENCE غیر متحرک قواعد کو زندہ کرنے کا پیمانہ ہے یہ قواعد اور اکائیوں دونوں سطحوں کو پرکھتا ہے۔

ہیلڈے کی اسلوبیاتی تنقید کو سیٹ کے نظریہ کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سری طرف اسٹائل مارکر کی شناخت میں بھی اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن سب سے نمایاں پہلو انتخاب اور اجتناب کا ہے۔

ہیڈلے کے معیار نقد سے نظریہ انتخاب Theory of choice اور نظریہ اجتناب Theory of Deviation کا واضح پہلو نکلتا ہے۔ اگرچہ رینک شیفٹنگ تخلیقی سطح پر ایک نوع کا انحراف ہے تو انحراف بھی ایک سطح پر انتخاب ہی ہے۔

اگر ہیڈلے کے بقول، "تخلیقی سانچوں میں باہمی معاونت کا نام اسلوب ہے، تو اس میں خالص انتخابیت کا نظریہ پوشیدہ نظر آتا ہے۔ بیلی نے باطنی اور اور خارجی اسلوبیات میں امتیازی نشانات کھینچے ہیں۔ اس کے مطابق، باطنی اسلوبیات ایک زبان کے موثر توازن اور اس کے منفی اثرات کا مطالعہ کرتی ہے جب کی خارجی اور بیرونی اسلوبیات میں ایک سے زیادہ زبانوں کے تقابلی مطالعہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بیلی کی مثبت اور منفی۔ خارجی اور بیرونی نیز ایک سے زیادہ زبانوں کے تقابلی مطالعہ سے بھی انتخابیت کے نظریہ کی تصدیق ہوتی منشا یہ ہے کہ اس نظریہ انتخابیت سے بھی اقبال کے اسلوب جلیل کی تصدیق

ہوتی ہے۔

کینتھ بروکس اور رابرٹ پین وارین CLENTH BROOKS & R. FENN WARREN کے مطابق اسلوب بہتر انتخاب کا نام ہے بقول اقبال حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوق آشکارائی

بروکس اور وارین نے UNDER STANDING POETRY میں اس نظریہ کی تفصیلات بیان کی ہے۔ تخلیق کی خصوصیات، اسلوب میں لسانی سانچوں کی تنظیم فنکار کی شخصیت نیز ماحول اور مطالعہ سب انتخاب کے نظریہ میں مضمر ہیں۔ لیکن اینکوسٹ کے نزدیک اسلوبیاتی عمل میں انتخاب کا نظریہ اہم نہیں ہے جبکہ داربرگ اور سی۔ ڈبلو۔ ہاکیٹ نظریہ انتخاب کے معترف ہیں۔ ان کے مطابق عمدہ اسلوب مساوی معنوی سطح والے لفظوں کے ادراک اور وجدان کے ذریعہ ظاہر ہونے والے الفاظ کے انتخاب میں موجود ہوتا ہے۔" گویا اس سے بھی اقبال کے اسلوب جلیل کو تقویت بہم پہونچتی ہے۔ داربرگ اور ہاکیٹ کے قول کی وضاحت میں اقبال کے اسلوب جلیل کی مزید تفصیل کو چھیڑے بغیر، اینکوسٹ کی ان قباحتوں پر روشنی ڈالنا محل بیان ہوگا، جو انھوں نے دکر یہ انتخاب کے ضمن میں پیش کیا ہے۔

(۱) یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ دو مختلف بیانات میں ظاہر ہونے والی خبر تقریباً مساوی ہے کہ نہیں ؟ اگر خبر مساوی سطح پر نہیں ہے جو ان کے مختلف سیاق وسباق کے سبب ظہور پزیر ہوئی ہیں تو ناممکن ہے کہ تحریر کی معمولی جنبش بھی معنیات کی سطح کو تبدیل نہ کردے۔

(۲) معنیات کے دائرے کا تعین بے حد گنجلک ہے، بالفرض معانی کو تکنیکی طریق کار سے

تفریحی خانوں میں رکھا جائے تو لفظوں کی معنوی حیثیت سے ایک فہرست تیار کرنی ہوگی ؛ جیسا کہ بعض اردو داں علماء نے کیا ہے اور ایسا کرنے پر اسلوبیات محض ایک لسانیاتی عمل کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا اور چند نحو و صرف اور قاعدوں کی تکرار کے سوا اسلوب کچھ نہیں رہ جاتا۔

(۳) اگرچہ تسلیم کر لیا جائے کہ زبان کے امکانی انتخاب کے ذریعہ مساوی قوت و اثر کے ساتھ خبر دی جا سکتی ہے لیکن یہ کیسے طے پا سکے گا کہ وہ خبر کب اتنی طاقتور ہو سکے گی کہ اسلوبیاتی عرفان بھی حاصل ہو۔ قواعد کے عناصر میں فنکار کس آزادی سے انتخاب کر سکتا ہے اور مختلف زبانوں کی تخلیقات کے ذریعہ کس حد تک مساوی معنی بیان کئے جا سکتے ہیں ؟' جواب دینا آسان بات نہیں ہے۔

یہاں اینکوسٹ کے بیانات کے پیش نظر اقبال کے اسلوب جلیل کا تجزیہ ضروری ہے۔ اول یہ کہ انتخابیت خصوصاً اقبال کی اسلوبیات کی انتخابیت کے خلاف یہ فرد جرم کہاں تک درست ہے کہ اقبال انتخابیت کے عمل میں کسی ایسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے ہوں گے کہ وہ مرکز ثقل سے دور ہو گئے ہوں گے ظاہر ہے کہ تخلیقی عمل فطرت انسانی سے ماورا کوئی چیز نہیں ہے۔ نیز یہ بھی علم ت اور تاریخ کے تناظر میں اقبال کا مطالعہ اینکوسٹ کے نظریہ کو مایوسی کا شکار بناتا ہے۔ دراصل فنکار کے احساسات جذبات، ادراک و وجدان کی وادی سے گذر کر تخلیقی محاکات کی لطف اندوزی سے عظیم ترین لفظوں کا انتخاب کرتا ہے ؛ اس اصول انتخاب کی روشنی میں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کا اسلوب جلیل اردو شعری تاریخ میں ایسا منتخبہ طریق کار شعریت ہے۔ جسکا خالق بھی اقبال ہے اور خاتم بھی اقبال اینکوسٹ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اقبال کا اسلوب جلیل ؎

ترا جوہر نوری، پاک ہے تو — فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں! فرشتہ و حور — کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

جوہر نوری کے ساتھ شاہین شہِ لولاک کا انتخاب، یہ اقبال کے اسلوب جلیل

کے شعری رویہ کا معمول ہے اگرچہ اینکوسٹ تنظیم کو سرے سے بے بنیاد قرار دیتا ہے لیکن اسلوبیات کا عمیق مطالعہ انتخابیت میں تنظیم کو بآسانی دیکھ لیتا ہے۔ اور اقبال کے اسلوب جلیل کو خالص مشرقی معیاروں میں تول کر دیکھئے تو قواعد لسانی اکائیوں، ان کی مختلف صورتوں اور زبان و بیان اور بدیع کے مختلف جلوؤں میں ہر جگہ انتخابیت کا عمل دکھائی دے گا۔ اینکوسٹ اور اقبال کے نظریہ اسلوب کا مطالعہ مندرجہ ذیل مصرعوں کی روشنی میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ؎

۱۔ وہ عالم مجبور ہے تو عالم آزاد

۲۔ تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحب آفاق

۳۔ علم تجھ سے ، تو معرفت مجھ سے

۴۔ تو خدا جو خدا نما ہوں میں

۵۔ تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا

جبکہ۔ عرش رب جلیل کا ہوں میں یعنی میرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا!

روز فاؤلر (R. FOWLER) نے زبان کے دو عنصروں کا بیان اپنی کتاب AN ESSAY ON STYLE AND LANGUAGE میں بہت تفصیل سے کیا ہے، یہ عناصر ہیں۔ غائب یا مضمر اور دوسرا ظاہر اور واضح۔ اقبال کا اسلوبیاتی عمل کا اکثر غائب اور موجود عنصروں کے بین بین چلتا ہے، اور اگر ان کی حرکت و گردش سے توانائی، شوکت و قوت کا اسلوب خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ انتخاب کا عمیق عمل بھی خاموش دریا کی طرح رواں رہتا ہے۔ یہاں اینکوسٹ کے اس قول سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اسلوبیات کے طریق کار کی شدید انفرادیت مخصوص گروپ کی تشکیل کرتی ہے۔ لیکن یہ بھی اردو شعری کا اتفاق ہے کہ اس مخصوص گروپ میں محض ایک ہی اسلوب

جلوہ گر ہے اور وہ ہے اقبالؔ کا اسلوب جلیل۔ لہٰذا اس کے امتیاز کو کسی طرح کا کوئی نقصان کہیں سے بھی لاحق نہیں ہوتا۔ اور یہ شاذ شاذ اقبالؔ کی فردیت اتنی مستثنیٰ اس لئے ہے کہ اس کی انتخابی کارروائیوں میں انحراف کا شدید رویہ (MOOD OF DEVIAT ION) کارفرما ہے۔ سیبک نے اس امر کے یوں ترجمان ہیں: کہ اسٹائل فرد کا اپنا ایک مخصوص انحراف ہے ظاہر ہے کہ اقبالؔ کا فنی سفر اسلوبیاتی سطح پر ہر جگہ انحرافات (DEVIATION) کا بانی ہے۔ نارم ہوں یا مخصوص لسانی اور تاجرانہ ذہنیت اور یا عیارانہ ادبی ساپنحوں (STRUCTURES) کی ساحری وغیرہ سے قطع نظر کرتے ہوئے اقبال نے ایک طاقتور اسلوب کی داغ بیل ڈالی جس میں شدید انحرافات کے چیلنج کے ساتھ ایک پاکیزہ انتخابیت کا عمل بھی مضمر ہے۔ لیچ (LEACH) نے انحراف (DEVIA TION) اور اس کے اقسام پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مطابق تحریر سے چونکا دینے سے یا کوئی شعبدہ بازی سے انحراف کی صفت پیدا نہیں کی جاسکتی اور اگر کی جاسکتی ہے تو یہ طریق کار مبتذل ہے۔ یہاں مختلف اقسام انحراف کی روشنی میں اسلوب اقبال کا اجمالی مطالعہ محل بیان ہے۔

(الف) قدیم یا عمومی لغت سے انحراف کر کے جدید الفاظ کی تخلیق سے اقبال عمومیت اور عمومی لغت کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ایلیٹ نے (SUFFER) میں FORE کا اضافہ کر کے FORE SUFFER لفظ اختراع کیا۔ لیکن اقبال نے نہ جانے کتنے ایسے الفاظ اختراع کر دیئے جن کی تفصیل کسی لغت سے نہیں بلکہ یہ کام کئی کتابوں سے بھی سرانجام دینا مشکل ہے مثلاً صرف دو لفظ۔ خودی اور شاہین۔ اور یاد رہے یہ الفاظ آزاد بندوں کی طرح ہیں اور ہر لاحقے و سابقے سے بالاتر ہیں جیسا کہ ایلیٹ وغیرہ نے کیا ہے۔

(ب) صرفی و نحوی انحرافات کی مثال، ادبیات اقبال میں بے شمار ہیں۔ اکثر ناقدین اسی نکتہ کے پیش نظر اسلوب اقبالؔ کا تعین کرتے ہیں۔ جب کہ معیاری انحراف معنوی اور جذباتی تڑپ سے تعلق سے رکھتا ہے۔ جہاں جذبہ و فکر کے انگارے

تلفظ اور لفظوں کی بندشوں سے بھی آزاد ہونا چاہتے ہوں، وہاں صرف ونحو کی کیا حقیقت؟ لیکن افسوس اقبال کے اسلوب جلیل کی تمازت کو کوئی انگیز نہ کرسکا ۔ لغت غریب جنینک تراوش نے گواہی ۔ حد ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی ۔ تو پھر اس شعر کو لسانیات سے کیسے سمجھا جاسکتا ہے ۔ لطف اور جمالیاتی حظ تو دور کی بات رہی ؂

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبرئیل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

(ج) صوتیاتی انحراف یعنی موسیقی کی سطح پر سماعت جس نوع کی صوتیات کی مانوس ہے، اقبال نے تخلیقی سطح پر اس مشکل انحراف کو ایک معمول کی طرح اپنے اسلوب کا حصہ بنایا ہے صرف چند مصرعے جس سے نکلنے والی موسیقی، علم صوتیات کی روشنی میں اردو شعریات نے پہلی بار سنی ۔ ملاحظہ کیجیے ۔

۱۔ غلام طغرل و سنجر نہیں ہوں
۲۔ پلا کے مجھ کو مے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو
۳۔ شریک زمرہ لَا یَحزَنُون کر
۴۔ نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
۵۔ تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ
۶۔ کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فَیَکُوں
۷۔ سبق شاہی بچوں کو دے رہی ہیں خاکبازی کا
۸۔ دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
۹۔ اسی جلال سے لبریز ہے ضمیر وجود

ان قوانیوں کی گردش و حرکت میں معنیات کی آفاقیت سمونا، اقبال کے اسلوب جلیل کا معمولی کام ہے ۔

(د) انحرافات کی ان مثالوں کے قطع نظر، اقبال نے رسم وخط، روزمرہ، ماحول اور وطنی تقاضوں کے خلاف انحرافات کی مثال قائم کر کے

اسلوبیات کو ایسی مثالیں فراہم کر دی ہیں جن پر الگ سے مقالہ لکھا جائے گا۔ مثلاً رسم خط کا انحراف ملاحظہ کیجئے:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ

اسی طرح روزمرہ کا انحراف کا مطالعہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اقبالؔ نے شرفاء کی زبان تو قبول کی ہے لیکن محاورہ سے ان کو شدید اختلاف ہے۔ ان کی کل اردو ادبیات کا مطالعہ شاہد ہے کہ اقبال نے شاید ہی چند محاوروں کو اپنے یہاں جگہ دی ہو۔ وجہ صاف ہے کہ اسلوب جلیل کی شان جلالت کے سامنے محاورہ بندی کی تکنیک تاب ہی نہیں لا سکتی۔ بانگ درا کے شروع کے حصوں میں خصوصاً بچوں کے لئے جو نظمیں اقبالؔ نے تخلیق کی ہے، اور جو دوسرے فنکاروں کے خیالوں سے ماخوذ ہیں، ان میں دو چار محاوروں کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ضرب کلیم بال جبرئیل ارمغان حجاز کی تخلیقات محاورہ بندی کے فن کو للکارتی ہیں جیسے شاہین کبوتر کو۔ اور اسی طرح اقبالؔ کی غزلیں ہمیشہ ماضی، حال اور مستقبل میں اپنے انحراف کی آپ مثال رہیں گی۔ لیکن یاد رہنا چاہیئے کہ اقبالؔ کا انحراف جاوداں تازہ پیرہن ہے جس کی چمن میں آسانی سے نمود ممکن نہیں ہے

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا۔

اور اس کے لئے ؎

کہنہ پیکر میں نہیں روح کو آباد کرے
یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

اقبالؔ نے مروجہ وطن پرستی کے رجحان پر کاری ضرب لگائی ہے چنداں وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن وطن دوستی کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وطنیت کی محدود فکر سے انحراف کیا ہے۔ صرف چند مصرعے پیش نظر ہیں:

۱۔ چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو

۲۔ غدار وطن اس کو بناتے ہیں برہمن

۳۔ ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

۴۔ ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی

۵۔ مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

۶۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال کے انحرافات میں ایک خاص قسم کا انتخاب جلوہ گر نظر آتا ہے، عمیق اسلوبیاتی تنقید اس امر پر شاہد ہے کہ فنکار اپنے اسٹائل سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتا اقبال کا اسٹائل مارکر "جلالت" ہے[1] لہٰذا کیفیت جلال ہر جا نمایاں طور پر اپنے اسلوب جلیل کے ذریعہ ظاہر ہوتا رہے گا۔ اگرچہ اقبال کا دعویٰ ہے ؎

میں صورتِ گلِ دست حبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہ جوش جنوں لہو ترنگ کا مصداق ہے نہ کہ جل ترنگ کا ؎

خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
قطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

لیکن اس لہو ترنگ کو مشک گرانمایہ میں تبدیل کرنے کیلئے کسی نافۂ آہو کا انتخاب کرنا ضروری ہے:

مشک از فر چیزے کیا ہے، اک لہو کی بوند تھے
مشک بنجاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

اقبال کا یہ انتخاب انحراف کی کتنی عمدہ تصویر پیش کرتا ہے، جس میں انطباق کا فن بھی پوری شان سے جلوہ گر ہے۔ حیرت یہ ہے کہ عہ دل نہ

---

[1] مری تقدیر ہے خاشاک سوزی۔ فقط بجلی ہوں، میں حاصل نہیں ہوں۔

سینے میں ہوا قطرہ سیماب ہوا تو وہ اشک جو آنکھ سے ٹپکا، وہ "درِ نایاب" میں کیسے تبدیل ہوا؟ اور اسکائل مار کر "جوہرِ نوری" کی کرسی جلالت پر کیسے متمکن ہوا تو اس کا جواب ہے کہ علویت و شکوہ اور اس کی خالصیت، شفافیت، فصاحت، معنویت، آفاقیت، معروفیت، بلاغت اور سب سے بڑھ کر تخلیقی جوہر کی حرکی تخیلی نظر (DYNAMIC IMAGINATIVE VISION) کا ہونا جو کسی جمیل و جلیل طاقتور شخصیت کے قلم کے رہینِ منت ہے۔ اقبال کے اسلوب جلیل میں محفوظ ہے ؎

میری نظر میں ہے یہی جمال و زیبائی — کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

اسلوبیاتی تنقید کے پیشِ نظر، اقبال کے اسلوبِ جلیل کے محض یہ چند اشارے تھے، جس کو ایک مختصر سے مقالہ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ورنہ اقبال کا اسلوب جلیل دراصل ایک کتاب پر محیط موضوع ہے جس کی معروضی، تجزیاتی اور عمیق موضوعی دریافت، ان پیش کردہ نکات کی روشنی میں بآسانی کی جا سکتی ہے۔ جو پھر کبھی، اگر خدا نے توفیق بخشی تو تکمیل کروں گا۔

مسجد قرطبہ

چند دلچسپ بیانات ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) "وہ بڑے شاعر ہیں اور اپنے شعری تصورات میں غالباً سب سے منفرد۔ آج ان کے کلام کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو خود ان کے دور میں رہی ہو گی۔ اس کی وجہ آج کی عصری زندگی میں ان کے تصورات کی عدم مقبولیت ہے"[1]

(۲) "اقبال مذہب کی طرف راغب ہوئے اور اس کی روح کو اسلامی افکار اور بعض مشرقی مفکرین کے تصورات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی"[2]

(۳) "روحانیت کا یہ تصور مشرقی اور اسلامی تصور تھا جس کے مطابق دنیا میں خدا کی نیابت اس فرد کے ذمہ تھی"[3]

(۴) "اقبال شاعر تھے، اچھے شاعر تھے اور زیادہ اچھے شاعر ہو سکتے تھے۔ اگر وہ شاعر ہونے پر قناعت کر لیتے اور پیغمبر بننے پر مصر نہ ہوتے۔ اس پیغمبری نے انکی شاعری پر کاری ضرب لگائی، لیکن اس کاری ضرب کے بعد بھی ان کی شاعری باقی رہی اور یہ ان کی شعری جانداری کا ثبوت ہے"[4]۔

(۵) "وہ یوں بھی شاعری کو "ساحری" گردانتے ہیں اور ساحری کو "پیغمبری" میں بدلنا چاہتے ہیں"[5]

(۶) "کبھی وہ "فلسفی شاعر" کہلاتے ہیں اور کبھی "شاعر مشرق" اور کبھی "شاعر اسلام"[6]

---

[1] جدید اردو نظم۔ نظریہ عمل۔ عقیل احمد صدیقی [2] پیش لفظ۔ اقبال ایک مطالعہ کلیم الدین احمد
[3] ایضا [4] جدید اردو نظم
[5] [6] ایضا

ان متضاد بیانات کو قرآن کی میزان پر تولیئے تو مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں آپ کو ذرا بھی گرانی نہ ہوگی۔

(۱) کسی شاعر کی عدم مقبولیت سے اسلام کی عصریت اور اس کی ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہوتی

(۲) ہوسکتا ہے کہ فنکار کے تصورات ہی اسلامی نہ ہوں

(۳) اور اس کا نیابت الٰہی کا تصور شعر و شاعری سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہو۔

(۴) نیز تخلیق آدم سے لے کر آنحضرت صلعم تک تاریخ انسانیت گواہ ہے کہ کوئی پیغمبر شاعر نہ ہوا اور کوئی شاعر پیغمبر۔

(۵) لہٰذا شاعر ساحر اور فلسفی تو ہوسکتا ہے کوئی عبقری مفکر نہیں۔

یقیناً اقبال پر اسلام کا یہ فیضان تھا کہ ان کو جادوگر ہندی نژاد کے ٹائیٹل سے یاد کیا گیا لیکن اقبال کو شاعر اسلام یا داعی اسلام (پیغمبر) وغیرہ کے خطابات سے سرفراز کرنا، زبردست جہالت اور علمی کم مائیگی کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اگر آپ نے قرآن کا مطالعہ نہیں کیا ہے تو آپ سے کون کہتا ہے کہ مطالعہ اقبال کے باب میں آپ اقبال کو پیغمبر بناتے پھرے اور انھیں اسلامی شاعر ثابت کرنے کے لئے سارا زور صرف کردیں۔ جیسا کہ مرحوم کلیم الدین احمد نے (بعض فلاں ہیں) کیا یا جیسا کہ عاشقانِ اقبال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے عقیل احمد صدیقی کا تنقیدی رویہ کافی معتدل ہے لیکن وہ بھی کسی حد تک سامری اقبال کی شعری سحر کاری کے اسیر نظر آتے ہیں؛

عقیل احمد، اقبال کی نظم، مسجد قرطبہ، کے تجزیے میں۔ عقیدت و محبت کا نذرانہ لٹاتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ "یہ نظم اس دائمی اور ابدی قدر کی تلاش کرتی ہے جو انسان کو فنا کے شدید احساس نکال کر ابدی کردار ادا کرسکے اور جس کے ذریعے انسان خدا کے روبرو اپنی انا یا خودی کا اثبات کرسکے۔ اقبال کے نزدیک انسان کے وجود کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے۔ نظم کا اصل مرکز و محور قرطبہ کی مسجد ہے۔ جسنے شاعر کے ذہن میں چند تصورات ابھارے ہیں۔ اور یہ سارے تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہوکر ایک نئے مطالبے کی تخلیق کرتے ہیں یعنی اس "انقلاب"

کی جسے فنکار نے بحیثیت پیغام اپنے مخاطب کیلئے منتخب کیا ہے۔ لیکن یہ پیغام براہِ راست نہیں دیا گیا۔ دراصل "مسجد قرطبہ ایک مخصوص منطق اور استدلال کی نظم ہے اور یہ استدلال تجریدی ہے کہ "وقت، عشق، مردِ مومن" بحیثیت تصور کے نظم میں آئے ہیں۔ البتہ فن کار نے ان سب کو ایک کردار عطا کیا ہے اور ہر کردار کی خصوصیات گنوائی ہے۔ ان کرداروں کا ایک مرکز و محور ایک تعمیر کا فن قرطبہ کی مسجد ہے جو اپنے مسلک گوہر کی مانند اپنے گرد پردے ہوئی ہے۔ یہ حقیقی شئے بھی اقبال کے تصور کے نہاخانے میں علامتی تجرید کا روپ دھار لیتی ہے اور اپنی معنوی وسعت کے ساتھ وقت کے سیل فنا کے سامنے "بقا اور ابدیت" کا ٹھوس استعارہ بن جاتی ہے۔ شاعر نے اس ٹھوس فنی تخلیق کے ذریعہ اس آئیڈیالزم کو پانے کی کوشش کی ہے قدریں فنا کی دسترس سے دور دائمی اور لازوال ہے۔[1]

یہاں پر عقیل احمد نے نہایت محتاط انداز میں علامت تجرید مخصوص استدلال اور منطق وغیرہ کا چکر چلا کر اقبال کے تصورات کے نہاں خانوں میں روپ آکار کا تعین کیا ہے اور سلک گوہر کے مانند، بقا اور ابدیت کا استعارہ ڈھونڈ نکالا ہے، لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس تلاش میں اسلام کی حقانیت اور اس کی ہمیشگی کو بغیر دلیل تسلیم کیا ہے تاہم یہاں بھی فلسفہ کا ہلکا سا بگھار موجود ہے۔ دراصل عقیل احمد اپنے اس تنقیدی رویے سے اگر ذرا بھی غفلت برتتے تو وہ بھی منجملہ تمام فاضل ناقدین کی طرح اس نظم کو اقبال کے ہی نہیں، اردو ادب کی اصل کائنات بتاتے۔ اور اسلام کا اسکو مینو فیسٹو ثابت کرتے۔ یا کم از کم اسکے ساتھ پیغمبری یا ساحری وغیرہ کا ہی ذکر کر لیتے تو بھی دوسرے کم مضمون کی فہرست میں شامل ہو جاتے لیکن انھوں نے یہ سب کچھ نہ کر کے چند سوالیہ نشان پیدا کر دیا ہے۔

نمبر ۱۔ اس نوع کے ناقدین اسلام کے کھلم کھلا بیان کو اپنی توہین سمجھتے ہیں اور اس کو ادب کا یا ادیب کے شایان شان تصور نہیں کرتے۔

[1] جدید اردو نظم۔ عقیل احمد صدیقی

نمبر ۲۔ اس نوع کے ادیب اسلام کی اصطلاح کو ناپسند کرتے ہوئے محض فنا اور بقا اور قدر وغیر کا چکر چلا کر بات کو کسی طرح ٹال دیتے ہیں۔

نمبر ۳۔ یا بعض ادیب مارے خوف کے اسلام کا نام نہیں لیتے، کیوں کہ اسلامیوں کا حشر ان کے سامنے ہوتا ہے۔

نمبر ۴۔ بعض ادیب اپنی ناواقفیت اور جہالت کے سبب، رٹی رٹائی اصطلاحوں کا سہارا لیتے ہیں اور چبائے ہوئے لقموں کو دوبارہ سجا کر کسی ادبی دستر خوان کی زینت بنا دیتے ہیں۔

نمبر ۵۔ بعض ادیب اسلام سے شدید بغض رکھتے ہیں لیکن مجبوراً اردو کی کمائی کھانے کے لئے کچھ کذب اور سب وشتم کے وار چلا کر اقبال سے رخصت ہوتے ہیں۔

عقیل احمد صدیقی کا معاملہ کچھ ادب، کچھ فیشن اور کچھ خوف کے سبب مبہم رہ گیا ہے۔ ورنہ وہ بھی کوئی دوسرا ہی منظر دکھلاتے۔

"مسجد قرطبہ" جو اقبالیات کی اصل دنیا ہے، ادب کے شایان شان چیز ہے اور فنا کی دسترس سے دور، دائمی اور لازوال نظم ہے۔ دراصل اقبال کی سب سے کمزور نظم ہے اور جس میں اسلامی نظریات کا کھلا ہوا مذاق مضمر ہے۔

یہ وہ نظم ہے جس میں بقا اور ابدیت کا تصور موجود ہے لیکن نظریہ آخرت مفقود ہے۔ اگرچہ اس میں سلسلۂ روز و شب کے چرچے بہت ہیں۔ اس نظم میں وقت، عشق، مرد مومن وغیرہ کو ایک کردار عطا کیا گیا ہے اور کردار کی خصوصیات بھی شمار کی گئی ہیں، لیکن بالکل تجریدی انداز میں بحیثیت تصور کہ جن کا اسلام کے ٹھوس، غیر مبتدل اور عملی نظریات سے کوئی تعلق نہیں یہی وجہ ہے کہ بر بنائے مشیت کہ ان سب کو فن تعمیر کی اس یادگار کے واسطہ سے بیان کیا گیا جو نہ سلک گوہر کے مانند ہے اور نہ فنا کی دسترس سے دور بلکہ ملوکیت کی ایسی علامت کہ جس کو ضرار کی فہرست میں لانا، کوئی تامل کی بات نہ ہوگی یہ عمارت اس آدمی کی یاد تازہ کرتی ہے جو نہ مرد جلال و

جمال تھا اور نہ نیابت الٰہی کے منصب پر فائز بلکہ اس گھٹیوں میں ملوکیت کا خون رچا بسا تھا جبھی اس کا عروج زوال سے ہمکنار ہوا اور اسپین کی قرطبہ ہمیشہ کے لئے درس عبرت کا ایک باب بن گئی۔ اور آج بھی تباہی کا ALARM بن کر ہمارے سامنے کھڑی ہے، فریاد رس ہے اور بتا رہی ہے کہ ملوکیت کو بقا نہیں اور اس کی نشانیوں کو بھی ویرانی، تنہائی اور غلامی کے سوا کوئی اور سوغات نہیں ملتی۔

نہ جانے کیسے اقبال نے مسجد قرطبہ کا انتخاب کر لیا قرطبہ سے تھوڑا اور سفر مشرق کرتے، فوراً مسجد اقصیٰ انھیں ملتی، ایک سے ایک جلیل القدر مردان عقل و عشق کی عبادت گاہ۔ اور اس سے بڑھ کر اگر چاہت اور زور مارتی تو "مسجد براہیمی" انکے قرطاس و ابیض کی منتظر تھی۔ مگر وہ مسجد حرام کی طرف بھی نہ گئے۔ نہ جانے کیوں اس مسجد اور اس شہر کی طرف اقبال نے رخت سفر نہ باندھا جس کی بزرگی اور پاکیزگی کے لئے رب جلیل قسم کا اہتمام کرتا ہے چشم بینا پر ایمان لانے والا صاحب نظر، کیسا دید ور تھا کہ قرطبہ کی مسجد کو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ لگا ہانکنے اور اس کا رشتہ ملوکیت سے کاٹ کر مرد مومن سے جوڑ دیا۔ کیا مسجد ضرار کی تعمیر کرنے والے مرد مومن ہوتے ہیں؟

پھر علی، حسین کی قربانیوں کے کیا معنیٰ؟ اس لحاظ سے شاہجہاں کو سب سے اونچے درجہ کا مومن ہونا چاہئے کہ اس نے مسجدوں کی باڑھ لگا دی اور بابر بھی کہ جس کا ہاتھ ؎

غالب کار آفریں کار کشا کارساز

کا مترادف تھا کیوں کہ مسجدیں تعمیر کرانے میں اس کا بھی جواب نہیں۔

دراصل ملوکیت اپنے ساتھ جو رجحان لے آتی ہے اس میں عبادت گاہوں کی تعمیر بھی ایک زبردست FACTOR ہے جو اس کے ظلموں پر ایک خوشنما پردہ کی طرح ہے اور ساتھ ہی ان کی تعیش پسندیوں اور نا انصافیوں کو ڈھانکنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ جہاں تک نام نہاد مسلمان بادشاہوں کی تعمیر کردہ مسجدوں کا مسئلہ ہے تو اقبال سے ہی لے کر کچھ نظریاتی اصول محل بیان ہیں۔

(۱) غیر خدا کی ملوکیت اپنی ہر شکل میں اسلام میں شرک ہے! اقتدار کی کرسی پر خدا کے نائبین کے علاوہ کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا ـــــ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں میں بادشاہت کا رواج چل پڑا جس کا سلسلہ آج تک دراز ہے۔

(۲) ان نام نہاد مسلمان بادشاہوں ـــــ نام نہاد مسلمان اس لئے کہ کوئی مسلمان نہ بادشاہ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی بادشاہ مسلمان! ـــــ کی بنوائی ہوئی مسجدوں میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے! ڈر لگتا ہے کہ زوال ہوتے ہوتے کہیں وہ دن نہ آجائے جب سود خوار اور طوائف کی بنوائی ہوئی مسجدوں میں نماز پڑھنے میں مسلمان کراہیت محسوس نہ کر سکیں۔

(۳) چوری، ڈکیتی، رشوت، جوا، دھوکہ فریب، زور زبردستی سے کی گئی آمدنی سے بنائی گئی مسجدوں میں نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔

(i) ڈاکو، دریائی ہو یا میدانی ـــــ دونوں کی آمدنی ناجائز ہے۔

(ii) ڈاکو، دریائی قزاق اور میدانی قزاق (بادشاہ) میں صرف ڈگری کا فرق ہے! مسلم یا غیر مسلم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا!

ایک دریائی قزاق گرفتار کر کے سکندر کے سامنے لایا گیا۔ سکندرانہ جاہ و جلال میں سکندر نے اس سے پوچھا:

"بتا تجھے کیا سزا دی جائے ـــــ تیری ہی بیڑیوں میں تجھے جکڑ کر زنداں میں ڈال دیا جائے یا میری تلوار تیری زندگی کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دے؟ لوٹنے سمندر میں جینا میں مشکل کر دیا ہے!"

"سکندر! جیسا دل و گردہ رکھنے والا وہ بے باک و جری قزاق اسی سکندرانہ لوٹن میں اس سے یوں گویا ہوا!

"اے زمین کے بادشاہ! سمندر کے بادشاہ کو تیری سمجھ پر ترس آتا ہے! ہم رتبہ سورما ایک دوسرے کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا کرتے! سچ بتا سفاکی کیا ہم دونوں کا پیشہ نہیں ہے! کیا ہم دونوں ہی قزاق

نہیں ہیں! البتہ ہم دونوں کا میدان کارزار الگ الگ ہے! تو خشکی کا شہسوار ہے اور میں پانی کا!"

قرآن یا حدیث نہ ہوتے ہوئے بھی یہ مومن کی گمشدہ پونجی ہے!

(۴) بادشاہ کی آمدنی بھی ناجائز ہوتی ہے!

میکدے میں ایک دن باہوش رند اپنے ہم مشربوں سے بڑے پتے کی باتیں کر رہا تھا! ــــ وہ کہہ رہا تھا:

"یارو! ہمارے شہر کے والی کی بھک منگائی کا جواب نہیں! ہمالے سروں کی لوٹ پیاں تک اس نے اتروالیں اور اپنے سر کا تاج بنوالیا! اس نے ہمالے جسم کے کپڑے تک لے لئے اور ان سے اپنی زرّیں قبائیں بنوالیں! اپنے کسانوں کا خون چوس چوس کر وہ لالہ گوں شراب تیار کراتا ہے! ان کے کھیتوں کی پیداوار سے اپنے محل کی تجوریوں کو سونے چاندی سے بھر لیا! خون پسینہ ان بے چاروں کا ہوتا ہے اور قسم قسم کی نعمتوں سے دسترخوان اس کا سجتا ہے! سچ ہے ہر مانگنے والا گدا ہے چاہے وہ بھیک مانگے یا طاقت کے بل پر خراج! سچ ہے میر و سلطاں سب گدا ہیں!"

(i) منگن کی بنوائی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے!

(۵) مسجد ضرار کو ڈھا دینا چاہیئے! دنیا میں تب سے اب تک صرف ایک ہی مسجد ضرار نہیں بنائی گئی ہے!

(i) مسلمان بادشاہوں کی بنوائی ہوئی مسجدیں، مسجد ضرار ہیں خواہ وہ سونے کی بنی ہوئی ہوں! انھوں نے مسجد بنوادیں تاکہ اسلامی تحریک کا گلہ گھوٹنے پر بھی مسلمان خواب غفلت سے بیدار نہ ہوں!

(۶) نام نہاد خلفاء کی آمدنی کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف ملاحظہ ہو:

جب المنصور نے عہدۂ قضاء قبول نہ کرنے پر انھیں تیس کوڑے مارے اور ان کا سارا بدن لہولہان ہو گیا تو خلیفہ کے چچا عبدالصمد بن علی

نے اس کو سخت ملامت کی کہ:

"یہ تم نے کیا کیا! اپنے اوپر ایک لاکھ تلواریں کھنچوالیں! یہ عراق کا فقہیہ ہے بلکہ یہ تمام اہلِ مشرق کا فقہیہ ہے!

منصور نے اس پر نادم ہو کر فی تازیانہ ایک ہزار درہم کے حساب سے تیس ہزار درہم امام کو بھجوائے لیکن انھوں نے لینے سے انکار کر دیا! کہا گیا لے کر خیرات کر دیجئے جواب میں فرمایا!

"کیا ان کے پاس مال حلال بھی ہے!"

کمال حیرت ہے کہ اقبال خانۂ کعبہ کو چھوڑ کر اس خانۂ قرطبہ کی طرف مائل ہوا۔ جس کی تعمیر میں مال حرام کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لگا جو ملوکیت کی یادگار ہے۔ اس امر کے مندرجہ ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال کی چشم بینا کا آئینہ ہی ناتواں ہوں اور خانۂ براہیمی کی اسیری اسے نظر ہی نہ آتی ہو۔

۲۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال نام نہاد مسلمانوں کی طرح معلوم اور محسوس غلامی کو ہی پابندی حیات سے تعبیر کرتا ہو۔

۳۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال کا سارا جھگڑا یہود و نصاریٰ سے رہا ہو۔ اور وہ مسجد قرطبہ کو دیکھ کر خود ہدف طنز و ملامت بنا اور اسکے جواب میں اس نے یہ نظم تخلیق کی۔ اگرچہ صحیح معنوں میں بعد خلافت حسن، کعبہ ہمیشہ دلداروں کے لئے چیلنج بن کر ابھرتا رہا۔

(۴) ہو سکتا ہے کہ اقبال نے صرف ادبی نمائش و آرائش کے لئے قرطبہ کا انتخاب کیا ہو اور گل افشانیٔ گفتار کے خاطر، مرد مومن، دم جبرئیل اور دل مصطفےٰ وغیرہ کی ترکیب۔ اپنی سابقہ روایات سخن کے تحت لایا ہو اور اس کا اسلام سے کوئی گہرا تعلق نہ ہو۔

(۵) کچھ بھی ہو یا کوئی اور سبب ہو، لیکن اتنا سچ ہے کہ نظم مسجد قرطبہ کی تخلیق سے یہ باور ہو گیا ہے کہ اقبال اسلام کے نظریہ آخرت کو

اپنے اعصاب اور اپنے دماغ و دل اور افکار کا حصہ نہیں بنا سکا۔

زمانہ کا ذکر ہوتا ہے۔ فلسفہ کی موشگافیاں ہوتی ہے۔ فن کار اپنے قاری کو خوب قلابازیاں کھلاتا ہے۔ شارحین نئے سے نئے مطالب تلاش کر لاتے ہیں۔ اقبال پرست سائنس، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، الٰہیات، علم نجوم، نیوٹن، آئیس ٹین وغیرہ وغیرہ نہ جانے کس سے کہاں سے رشتہ جوڑتے ہیں لیکن ایک بھی ایسا بندۂ خدا نہیں ملتا جو زمانہ کو روز آخرت سے جوڑ دے۔ تقدیر سے اس کا رشتہ جوڑے اور خدا کا پتہ بتائے۔ اقبال جس کو روز مکانات کہتا ہے وہی روز جزا ہے اور جو بغیر زمانہ کے برپا نہ ہوگا۔ اور یہ نظریہ اس لئے ناپید ہے کہ اقبال خود بھی مکمل شرح و بسط کے ساتھ "مالک یوم الدین" کی تشریحات کرنے سے معذور نظر آتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کوئی داعی اسلام نہ تھے نہ اسلام کے ترجمان، محض ایک شاعر تھے اور شاعری کی دنیا میں رہ کر شاعروں کی طرح تصورات میں کھوئے رہتے تھے، کبھی جذباتی ہو جاتے، کبھی طبیعت کا رنگ بدل جاتا تو رونے لگتے اور کبھی کبھی جھوم جھوم کر نغمہ سنج ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ آپ ان کے نغموں میں اسلام کے زرّیں اصولوں کی لہک اور لپک کو شامل کر سکتے ہیں جس سے ان کے کلام کی شان نرالی ہو گئی ہے اور جس کے بوتے پر وہ جاوداں۔ جاوداں زندہ رہیں گے اور آج موضوع سخن ہیں اور کل بھی رہیں گے۔

عشق تمام مصطفےٰ! عقل تمام بولہبؐ

شعر شور انگیز جلد اوّل میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں، "عشق کے مختلف تجربات اور صورحالات اتنی انتہائی شکلیں جو میر کے کلام میں اتنی کثرت سے ملتی ہے، اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے یہاں عشق اور زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے. زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ عشق میں ہوتا ہے اور عشق میں وہ سب کچھ ممکن ہے جو زندگی میں ممکن ہے۔ اس کو درج ذیل نقشے سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

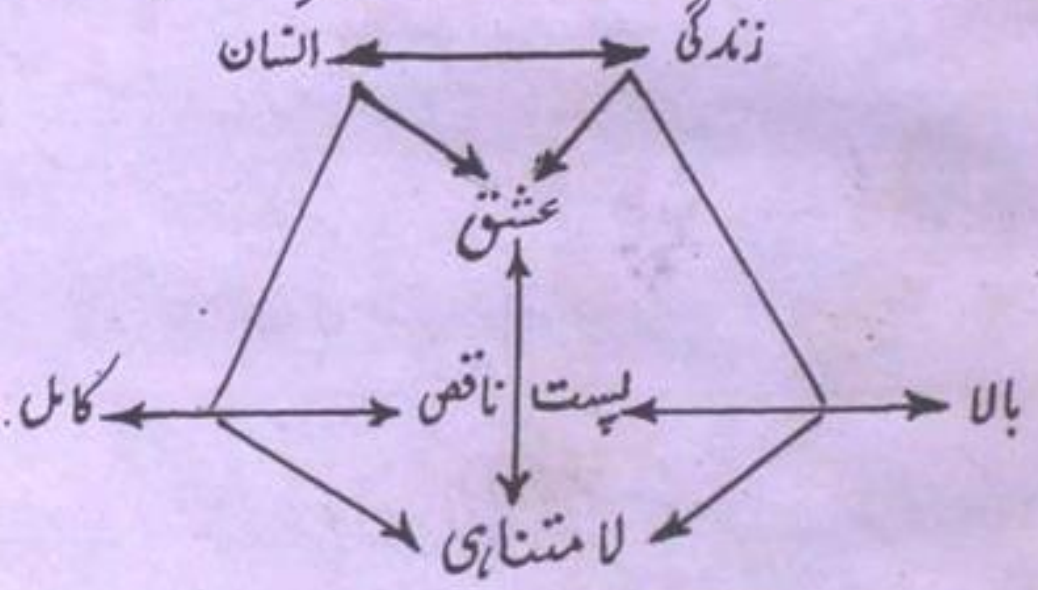

لہٰذا اگر عشق ہے تو زندگی میں ہے، اور اگر زندگی ہے تو عشق میں ہے۔ عشق چونکہ انسان زندگی دونوں کا محور ہے، اس لئے عشق میں انسان اور اس کا وجود دونوں ایک ہو جاتے ہیں"

اقبال بھی میر سے کم نہیں ہے بلکہ عشق کا تجربہ جس شش جہات انداز میں اقبال

نے کیا ہے، میر کو بھی میسر نہیں۔ مشرقی روایات ہوں یا انسانی عظمتوں کا سوالی، انسان کی غیر معتبری کے استعارے کے طور پر کوئی گفتگو ہو یا انسان و کائنات کی فنا و بقا کا مسئلہ، مابعد الطبیعات کی تجریدی فضا یا خواب کے میدان یا بے حد کامل یا بے حد ناقص زندگی یا انسان یا اس کی زندگی کے حوالے سے اس کی بلندی یا پستی۔ سب۔ اس عشق میں مضمر ہیں۔ اقبال کے عشق کا ہر تجربہ ہر جگہ صحیح اور درست ہے۔ شاید میر سے بھی زیادہ ہے ٥

عشق کیا ہے؟ عشق بے چارہ، نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم۔ لیکن یہ تعریف منفی لہجے میں کہی گئی تاکہ شاید اثباتی رویے کے امکانات اور واضح ہو جائیں۔ اور اس کے مختلف انسلاکات مثلاً عقل، جسم، روح، عبادت، فلسفہ، ریاضت، دانائی وغیرہ کے ساتھ معصومیت، جنون پسندی، یک کیفیت انداز۔ اور اس کے ملا، زاہد اور حاکم کے ساتھ مستقل ٹکراؤ کی بھی وضاحت ہو جائے۔ عشق کی بے چارگی میں نکتہ اغلب پوشیدہ ہو سکتا ہے کہ مسئلہ جبر و قدر بھی مضمر ہو لیکن۔ اس کا ملا، زاہد اور حکیم سے ٹکر لینا، اس بات پر دلیل ہے کہ تنہا ان سب کیلئے وہ کافی ہے۔ یہاں یہ بھی معنیٰ بالکل صاف ظاہر ہو رہے ہیں کہ عشق اکیلا کافی ہے۔ دنیا کے تمام عیاریوں یا دانائیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے عشق اکیلا اور تنہا، بے چارہ مظلومیت کا شکار ہے تاہم تمام کائنات کو مسخر کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میر کے عشق کے جنسی تجربوں کے قطع نظر، اقبال کے عشق کے تجربوں کی ایک معمولی مثال ہے، جو مصرعہ ھٰذا کی تشریح میں سامنے آئی۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ پوری شان کے ساتھ قائم ہے کہ اقبال کا عشق کیا ہے؟

اقبال کے عاشقانہ تجربوں اور اس کی شش جہات منزلوں کی پیمائش سے عشق کی تشریح ممکن ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اقبال کے مختلف شعری تجربوں میں عشق کی مختلف نوعیتوں کا بیان اجمالاً اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) عشق، گہر آب دار کے مثل ہے۔ کم ہیں جو اس کی لذت سے ہمکنار ہوئے ہیں، جو پنہاں ہے، خدا ظل جلال کی جلوہ گاہ میں مضمر، ظاہر پرست اسے کیا جانیں؟

(از درد عشق)

(۲) عشق، انسان کے دل کا شرر ہے، جو نورِ مطلق سے مستعار ہے کہ جہاں ظلمت کا کوئی گذارہ نہیں، موت اس پر حرام ہے اور بقا اس کا مقدر (از عشق اور موت)

(۳) عشق کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ پیش ہے۔ نورِ نجم، داغِ جگر مہتاب، شب کی زلف برہم، بجلی کی تڑپ، پاکیزگی حور، نقش ہائے مسیح ابن مریم کی حرارت، ربوبیت کی شان بے نیازی عاجزی ملک۔ افتادگی تقدیرِ شبنم، آبِ چشمِ حیواں ان دس عناصر کے مرکب کا نام عشق ہے۔ (بانگ درا ددم)

حسن سے عشق کی فطرت کو تحریک کمال حاصل ہوتا ہے۔ اور انسان کے آئینہ میں اس سے نئے جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ (از حسن و عشق)

(۴) انسان عجب مجموعہ اضداد ہے۔ رونقِ ہنگامہ محفل بھی ہے اور تنہائی کی انتہا بھی۔ مثل بوئے گل لباس رنگ سے عریاں، بے نقش پا مانند موج، تیرا عشق عجب بے پرواہ ہے۔ اگرچہ ؎

حسن تسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے
لیکن: آرزو ہر کیفیت میں ایک نئے جلوے کی ہے (از عاشق ہرجائی)

(۵) عشق بمطابق علم دیوانہ ہے جبکہ عشق علم کو تخمین و ظن سے زیادہ رتبہ دینے کو تیار نہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ عشق سراپا حضور ہے جب کہ علم سراپا حجاب ہے، عشق سے معرکۂ کائنات، تماشائے ذات، سکون و ثبات، حیات و ممات اور تمام پنہاں سوال کا جواب ہے۔ عشق کے معجزات فقر و دیں تاج و نگیں، زماں و زمیں، اور مکاں و مکیں ہیں جب کہ علم سوال و شبہہ کے کچھ نہیں ہے۔ دراصل علم ابن الکتاب ہے اور عشق ام الکتاب ہے۔ (از علم و عشق)

(۶) کائنات کے ذرہ ذرہ میں ذوقِ آشکارائی موجود ہے۔ لہٰذا انسان میں نگاہِ شوق موجود کیوں نہ ہو، اسی نگاہ سے ہر ذرہ جنون پسند اور رہ و رسم دشت پیمائی کا طالب ہے جس کو یہ میسر نہیں، اس کا وجود سراسر رسوائی کا موجب ہے۔ (از نگاہ شوق)

(۷) مردِ خدا کا عمل عشق سے صاف ہوتا ہے۔ عشق اصل حیات ہے۔ اور موت

اس پر حرام ہے۔ عشق ایک سیل ہے، نارِ حیات اور لونِ حیات ہے بیکرِ گل، عشق کی مستی سے تابناک ہے، عشق صہبائے خام اور کاس الکرام ہے۔ وفقیہہ حرم اور امیر جنود ہے۔ سراپا دوام، امروز و فردا سے ماورا۔ اسی کی مضراب کے گرم سے تارِ حیات سے نغمیں پھوٹتے ہیں، عشق دمِ جبرئیل اور دلِ مصطفٰے کا مصداق ہے۔ اور عشق ہی خدا کا رسول اور اس کی کتاب ہے۔ مردِ مومن حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل اور عشق کا حاصل ہوتا ہے۔

(۸) عشق وہ ساغرِ لبریز کی صورت ہے جس کا پیمانہ جادۂ ملک بقا کی منزل "دل" ہے۔ دل کی منزل عرش معلےٰ ہے یا کعبہ، اسے کس کا سودا اور جنون ہے! زاہد ناداں کیا جانیں؟ (از دل)

(۹) دل سدرہ آشنا، خدا نما ہے جب کہ عقل فریبِ ہستی کے سوا کچھ نہیں۔ اور دل باطن آشنا، چراغِ حسنِ ازل، اور رب جلیل کا پڑوسی ہے۔ عقل و دل سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی — حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

دل عشق کا وطن، نقطہ پرکارِ حق کا محور، یقین مردِ خدا کا مرکز، اک ایمان کا اجمال ہے۔ دل سے عشق کی دنیا آباد ہے۔ عشق بے چارہ، نہ ملا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم۔ صبحِ ازل ہی دل سے جبرئیل نے کہا کہ ایسے دل سے گذر جا جو عقل کا غلام ہو (از سلطان ٹیپو کی وصیت) اور اگر چشمِ دل وا ہو تو تقدیرِ عالم بے حجاب ہے۔

(از خضرِ راہ)۔ زمانہ عقل پر بھروسہ کیے بیٹھا ہے (از دل) جب کہ اسے اپنوں بتوں سے کب نجات حاصل ہوئی ہے (از زمین) آہ، دنیا گوشت کے ایک معمولی لوتھڑے کو جسے دل سمجھتی ہے، وہ دل نہیں ہے بلکہ دل پہلوئے انسان میں ایک ہنگامہ خاموش ہے۔ (از دل) کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں سلطنت روم و شام درے نہیں جچتی ؟ (از سرود) اقبال کہتے ہیں ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کی جنوں بھی ہے صاحب ادراک

" عقل عیار ہے، بہروپیا ہے اور دھوکے باز ہے (از فلسفہ) میان غیب وحضور میں عقل مضطرب ہے، اور اس کا مقام اعراف ہے، اس لئے شعور و ہوش و خرد سب دل کے رقیب اور شوق کے دشمن ہیں (از غزلیات) عقل و خرد کے ہر لحظہ نئے فتنون سے سوز و ساز کی نئی سے نئی محفلیں آباد ہیں۔ اور مرحلہ شوق کی منزلوں کے لئے چیلنج کی صورت ہے۔ دل کو اس کا یہ چیلنج قبول ہے۔ ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی۔ باہر نہیں کچھ عقل خداداد کی زد سے عالم ہے غلام اس کے جلال ازلی کا اک دل ہے کہ ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے دل اس عیار مصلحت پسند، نقاد عقل سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحب لولاک، صاحب ادراک مرد خود آگاہ خدا مست مئے لا اِلٰہ اِلّا ہُو پیکر عالم من دلنو سے بیگانہ، حدیث رندانہ کا محرم، نغمہ جبرئیل و صور اسرافیل کا نکتہ داں اور لامکاں کا ہم نشیں ہے :

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

اس جنون پسند دل سے خرد و ہوش کا کیا مقابلہ ؟ یہ دل عشق بن کر آگ کے الاؤ میں بغیر کسی تردد کے کود پڑتا ہے اور عقل محوِ تماشائے لب بام کی مصداق کے سوا کچھ نہیں رہ پاتی۔ دلِ بیقرار کے ذوق و شوق کا یہ عالم ہے کہ اس کی ایک ہی جست بے کراں زمین و آسمان کے کافی ہے۔ دراصل عشق ہی سے یہ سادہ دخموش و دل آزاد عقل و کفر و زندیق کی غلامی سے نجات پاتا ہے۔ اور اس میں آفاق کی نا معلوم

سرحدیں گم ہو جاتی ہیں تسخیر آفاق کا کیا سوال ؟

لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ عشق کوئی بازیچۂ اطفال یا شعریات میرؔ کا محزوم کرنہیں بلکہ ؎

مقام شوق تیرے قدسیوں کا بس نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جنکے حوصلے ہیں زیاد

یہ عشق ہی ہے جس کے خورشید سے شام اجل شر ملتہب ہے۔ وہ کبھی تنہائی دکوہ ودامن کا مصداق ہے تو کبھی مولا علیؓ خیبر شکن کا غماز ہے صدق خلیل، صبر حسین، بدر حنین کے معرکے سب عشق کے فیضان کے مظاہر ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ

ع عشق تمام مصطفیٰ ! عقل تمام بولہب

عشق کی اتنی جہتوں اور کیفیتوں کا بیان کیا کسی دوسرے شاعر نے بھی اردو میں کیا ہے؟ آپ کا جواب ہوگا، جناب ! یہ عشق کے تجربوں کا مبنی واردات نہیں ہے بلکہ شاعر کے ایمان وعقیدہ کی بات ہے جسے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا کر شاعری کا درجہ دے دیا گیا ہے ورنہ مثلاً عشق کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام" عقیدہ کی بات نہیں ہے تو ہے کیا؟ ایسے معترضین کے لئے یہ جواب کافی ہے کہ اسے جو عقیدہ وایمان مان کر چلتے ہیں ان کی مرضی ایک اصل میں یہ ایک شاعرانہ کیفیت کا منظر نامہ ہے جس کو نہ جانے کیوں لوگ ایمان وعقیدہ کا مسئلہ بنا رہے ہیں۔ کچھ لوگ اگر آیت کریمہ کا ورد کریں یا کسی خاص تاریخی حوالے سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بھائی ! یہ سراسر تلمیح ہے اور اس میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے اور یہ شاعر کے عشق کے کسی پہلو کا بھی تجربہ نہیں ہے تو ان کے لئے عرض ہے کہ، "عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام" شاعر کے تمام عشق کے کیفیاتی تجربہ پر مبنی ایک حادثہ قلب ہے نا کہ کسی تاریخی واقعہ یا الہام سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔ کہا گیا کہ کیا کوئی شخص راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ گھوم کے واپس آسکتا ہے۔ جواب ملا "نہیں" "یہ ناممکن ہے"۔ کہا کہ اگر یہ ناممکن ہے تو اس بات کا دعویٰ تمہارے صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کرتے ہیں۔ جواب ملا، "پھر خدا کی قسم ! وہ سچ کہتے ہیں،" گویا پاک ہے وہ ذات

بابرکت جو اپنے رسول کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا۔" اتنی سی بات کو جس تجریدی کیفیت میں سمیٹا گیا، قابل تعریف ہے،

"عشق کی ایک جست" کی تفسیر میں نہ جانے کتنی فتوجات سر کی جا سکتی ہیں. واقعہ معراج، دراصل کوئی جست وغیرہ نہیں ہے بلکہ رب جلیل کی بارگاہ میں اس کے رسول کی کی باریابی ہے۔ یہ باریابی صرف اور صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں آئی۔ آدم تا محمد صلے اللہ علیہ وسلم، صرف احمد مرسل کو خدا کے حضور بلایا گیا۔ اور یہ خوش نصیبی نہ کسی کے مقدر میں آئی اور نہ آ سکتی ہے اور نہ آئے گی۔ یہ واقعہ عشق کی جست سے ظہور میں نہیں آیا تھا، ورنہ یہ جواب ملنے کے بعد کہ یہ ناممکن ہے، ممکن کیسے ہو جاتا؟

جب کوئی شخص زندگی کا سخت سے سخت معیار بناتا ہے، اور ایک خوابوں کی دنیا سجاتا ہے تو اس کی دنیا میں کوئی جچتا نہیں؛ لیکن اگر اس کے ذریعہ بنائے گئے سخت سے سخت معیار پر کوئی کھرا اتر جاتا ہے اور بار بار آزمائش امتحان سے کھرا ہی اتر جاتا ہے تو اس کو سوچنا پڑتا ہے کہ میرا صاحب جو کہتا ہے، سچ کہتا ہے؛ ہر نفع ونقصان سے بالاتر ہو کر، میرے نفع ونقصان کا خیال کرتے ہوئے میرا حقیقی دوست ومحسن بن کر میرے دماغ کی کہتا ہے وہ کہتا ہے، غیب پر ایمان لاؤ۔ لوگ ایمان لے آتے ہیں۔ وہ کہتا ہے پچھلی امتوں کی تباہی کے یہ اسباب ہیں، ان کو سمجھو، جانو اور ان سے عبرت حاصل کرو تو لوگ قصہ کہانی سمجھ کر اسے ٹال نہیں دیتے بلکہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور اسے نسخہ کیمیا جانتے ہیں؛ عمل پیرا ہوتے ہیں اور قیصر وکسریٰ کو شکست دیتے ہیں۔ عشق کی ایک جست میں تجریدی کیفیت نیز جذبات کی ایسی فضا ہے کہ عقل محو تماشائی بن کر رہ جاتی ہے۔ جب کہ واقعہ معراج جذبہ کیفیت سے متعلق نہ ہو کر خالص عقل وعمل کی سچائی پر مبنی ہے۔ جس کی گہرائی وگیرائی میں عبادت اور عمل کی خشکی اور سختی پائی جاتی ہے نہ کہ جذبات کی رنگینی اور حواس کو میسر آنے والا انبساط۔ اور اسی طرح آتش نمرود میں عشق کے بے تحاشہ کود پڑنے کا ماجرا بھی واردات عشق پر مبنی ہے شاعر کا اپنا کوئی تجربہ ہے نہ کہ حضرت ابراہیم کا الاؤ میں ڈالے جانے والے واقعہ سے اسکا سروکار ہے۔ یہ فراست مومن کا شعور کامل ہے جو اسنے آتش نمرود کا انتخاب کیا،

بہت سوچ وچار کے بعد، بے تحاشا، بے خطر، انجام سے بے پرواہو کر نہیں، بلکہ جان بوجھ کر کہ آگ کا کام جلانا ہے، پھر بھی رب کی مرضی یہی ہے۔ وہ جس حال میں رکھے اسکا کرم ہے، وہ شکر گزار بندوں میں سے تھا۔ باطل اقتدار کے سامنے نہیں جھکا، اور آگ کو پسند کیا۔ آگ کا کام صرف جلانا ہے، کیا دنیا صاحب اخدود کا واقعہ بھول گئی؟ جو آگ میں ہی جلا کر مارے گئے تھے؟ لیکن اقبال کو اپنے عشق کے ایک تجربے کو شعری جامہ میں منتقل کرنا تھا، عقل و خرد کو بالائے طاق رکھ کر، واردات قلبی کی شدت کو اقبال نے اپنے عشق کے تجربے کو جس عمومی رنگ سے نوازنے کی کوشش کی ہے، وہ شان براہیمی کی توہین ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اس ذات کا نام ہے جو اسلامیوں میں عقل و خرد سے مشہور ہے۔ بچپن دیکھیے یا جوانی۔ ہر جگہ زبردست سوچ، فکر اور دماغ کی کارستانی نظر آئے گی۔ اتنا بڑا واقعہ ہو جائے اور وہ اپنے دماغ کو موقوف کر دے! یہ اقبال کے عشق کا چکر ہو سکتا ہے؛ قرآن اس کا شاہد نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ پورے قرآن کا مطالعہ کر جائیے۔ لفظ۔ لفظ، کمپیوٹر کی مدد سے چھان بین لیجئے، لفظ، "عشق" کہیں بھی دستیاب ہو گا۔ ایمان و عقیدہ کا مسئلہ ہو یا احسان و شہادت کا درجہ، قرآن کے صفحات میں ایک جگہ بھی لفظ "عشق" جگہ نہ پا سکا، یہ ہے عشق کی اوقات! نہ یہ کوئی اتفاق ہے، نہ تجرید کا مسئلہ اور نہ ہی میر و غالب کے شعری تجربوں میں مستعمل لفظی مباحثہ کا حیرت انگیز پہلو۔ اور نہ ہی اسلوبیاتی کے انتخاب (CHOICE) اجتناب (DEVIATION) یا لسانی اکائیوں (LINGUISTIC UNITS) کے برتنے کا معاملہ۔ یہ معاملہ ہے ایسے کلام کا جس کو کم سے کم ایک ارب انسان بہت سوچنے سمجھنے کے بعد کلام خداوندی مانتا ہے نہ جانے کب سے مان رہا ہے اور نہ جانے کب تک مانے گا، جب تک قیامت برپا نہ ہو جائے۔

اس کا دعویٰ عقلی ہے، لے آؤ، اس جیسی کوئی عبارت، اسلوبیات، معنیات، ادبیات، جنسیات کسی طرح آؤ مقابلہ کرنے۔ کچھ ہوتا تو لے آتے۔ ۱۴ سو سال ہو گئے، کچھ احمق پیدا ہوئے، لے آئے عشق و دل کے تجربوں مبنی مصالحوں کو، لیکن ان کے

دیوان کے دیوان قرآن کی صرف ایک عبارت کے سامنے ہی اڑ گئے، تلاش بسیار سے شاید کہیں کچھ مل جائے لیکن وہ عبارت ہر خاص و عام کے لئے بطور قول محال زبان پر زندہ ہے۔ وجہ صاف کی یہ عبارت احد، صمد اور لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کی ہے۔ نیہاں عشق و دل کا گزر نہیں۔

اہل لغت نے عشق کے معنی "فَرْطُ الحُبّ" یعنی حد سے بڑھی ہوئی کے لکھے ہیں محبت کے جذبہ میں ایک ڈگری یا کئی ڈگری اضافہ کر دیا جائے تو عشق کا وجود ہو جاتا ہے۔ اور صاف لفظوں میں یہ کہ محبت کا حد سے زیادہ بڑھ جانا، عشق ہے۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ قرآن کو محبت مطلوب ہے، عشق نہیں۔ وہ احسان و محبت کو پسند کرتا ہے، اور عشق ٹھوکر مارتا ہے۔ جب کہ بات پھر دوہرانا لطف سے خالی نہ ہوگا کہ لغوی لحاظ سے محبت ادنیٰ درجہ کی چیز ہے اور عشق برتر درجہ کی چیز۔ پھر قرآن کو عشق و مطلوب نہ ہو کر محبت کیوں مطلوب ہے۔ ایک زبردست سوالیہ نشان ہے۔ مزید طرّہ یہ کہ قرآن، لفظ، "عشق" سے مکمل اجتناب (TOTAL DEVIATION) کرتا ہے، ایسا کیوں؟ گویا کہ محبت کے جذبہ کو حد سے زیادہ فزوں تر کرنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس پر قرآن پابندی لگاتا ہے! یہ معاملہ ماورائے تعقل نظر آتا ہے لیکن آیئے! عقل و شعور کی روشنی میں، عاشقانہ تجربوں کی کیفیتوں کو بالائے طاق رکھ کر فہم و فراست کی نظر سے عشق اور محبت کی نوعیتوں پر غور کریں۔

محبت کے لغوی معنی ہیں، "کسی ایسی چیز کا ارادہ کرنا یا اسکا چاہنا" معنی یافت جس سے کسی نیک یا مرغوب شے کا ملنا یقینی یا متوقع ہو۔ اس لفظ کے معنی پسند کرنا، چاہنا، نقیض البغض۔ بغض کی ضد، عزیز رکھنا، دشمنی کی ضد وغیرہ بھی ملتا ہے۔ پسندیدگی صرف جذباتی یا طبعی بنیادوں پر نہیں ہوا کرتی، خالص عقلی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ اور جب کہ نفرت و بغض ہے کہ وہ عقلی و طبعی دونوں شکلوں میں دستیاب ہیں۔ آپ کو کوئی کپڑا اس لئے پسند ہو سکتا ہے کہ اسکا رنگ دیدہ زیب ہے، اور اس کی ڈیزائن طبعی رجحان کو پسندیدگی کی طرف مائل کر رہی ہے، لیکن وہ کپڑا اس لئے مزید پسند ہے کہ وہ دراصل سستا ہے، ٹکاؤ اور مضبوط ہے۔ اور اس طرح کوئی کپڑا اس لیئے

ناپسند ہو سکتا ہے کہ وہ نہ تو جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے اور نہ سستا اوڑھکاؤ اور مضبوط ہے۔ اسی طرح کوئی حسینہ اپنی خودبو کے سبب، کشش کا اعتبار بن سکتی ہے اور عام و خاص کے جذبات کو اپنی طرف ملتفت کر سکتی ہے لیکن یہ معلوم یا شبہہ ہو جانے کے بعد کہ یہ حسینہ ایڈس کی مریض ہے، اس کے تمام حسن کے بعد شاید لوگ اس کی طرف دیکھنا بھی نہ پسند کریں، اور اس سے دور۔ دور کترا کر نکل جانا، مناسب سمجھیں۔ آیئے تاریخ سے کچھ مثالیں؛ جسے اقبال نے "صبر حسین بھی ہے عشق" کہا ہے، وہ عشق کی مثال نہیں ہے۔ بلکہ صاف عقل کا فیصلہ تھا۔ ایک طرف یزید کی دی جانے والی خوبصورت پیشکش تھیں، ان پیشکشوں کو قبول نہ کرنے پر زندگی کے چراغ کے گل ہونے کا خطرہ تھا۔ اور دوسری طرف اسلام کی حفاظت کا سوال اور آخرت میں رسول اور اس کے خدا کو منہ دکھانے کا معاملہ تھا۔ ایک طرف دین حق کی محبت تھی تو دوسری طرف ظلم کا اپنی انتہاؤں سے گذر جانے کا اندیشہ لاحق تھا۔ ظالم کے چمن زار کو منتخب کرنے کا یہ مطلب تھا کہ خدا کے روبرو، اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنا، چند روزہ دنیاوی زندگی کا مزہ لینا، اور اس کے برعکس، اپنی پسند کا اظہار کرنا، اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا تھا۔ حسین نے ہلاکت کا سودا پسند کیا؛ پورے شعور کامل کے ساتھ بہت سوچ وچار کرنے کے بعد۔ بڑی بڑی شرطیں وغیرہ رکھیں۔ جب ہر نسخہ بیکار گیا۔ تو ظلم کا نشانہ بننے کو تیار ہو گئے۔ یہ محبت کا مقام ہے یہ نہیں تھا کہ اب کچھ چارہ ہی نہیں ہے، صبر کے سوا؛ مجبوراً صبر کر لو! یہ صبر حسین کی شان میں توہین ہے۔ حسین شہید کبریا ہے۔ اس کی شہادت توازن کامل اور شعور کامل کی شہادت ہے۔ نہ کہ کسی جذباتی انسان کی شہادت کہ نعرہ لگایا چل گیا رہوئی اور میدان جہاد میں کود پڑے، بغیر سوچے سمجھے۔ اور اسی طرح جب صفین میں نیزوں پر قرآن اٹھا لیا گیا تھا تو وہاں پر بھی "عقل" کا کھیل رونما ہوا تھا، اگرچہ وہاں بعض عنصر سنایاں تھا، اور علی کے لاکھ کہنے پر بھی لوگوں نے قرآن سے اپنے جذباتی اور طبعی تعلق کو ترجیح دیا اور جنگ رک گئی۔ قرآن سے یہ عام گرویدگی یا پسندیدگی جو حد سے بڑھ گئی تھی سے مخالف کا نفسیاتی حربہ سو فیصد کامیاب رہا۔ لوگوں کی عقلیں پتھرا گئیں تھیں قرآن کو ایسی مجنون محبت مطلوب نہیں ہے کہ جزدان

ہیں بند قرآن پر عمل کرو اور چلتے پھرتے اور بولتے فاعل قرآن کا انکار کردو۔

غرضکہ کپڑے کی خرید ہو یا دین الٰہی کی حفاظت کا جذبہ، ہر جگہ جہاں نفع ونقصان شامل ہو جاتا ہے، عقل حاضر اور موجود ہو جاتی ہے۔ قرآن کو ایسی ہی گرویدگی یا پسندیدگی مطلوب ہے جو تمام تر عقلی ہو، جس کی کوئی سائنٹیفک بنا ہو اسے ایسی محبت سے کوئی سروکار نہیں، جو صرف جذباتی اور طبعی ہو جس کے بدلنے، متغیر ہونے یا پلٹ جانے میں کوئی وقت نہ لگے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم نے دن کو بڑے ذوق وشوق سے بلایا اور جب وہ آگئے تو مارے خوف کے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دراصل نفرت ومحبت کا سرچشمہ عقل ہے۔ اور عقل کسی جذبہ کو حد سے زیادہ بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ خدا کی محبت مطلوب ہے۔ نماز اس کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی محبت کو پانے کے لیے صبح سے شام تک آپ نمازیں پڑھتے رہیئے۔ یہ کام عقل کے خلاف ہے۔ خدا ایسے نمازی کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو اس کی محبت میں حد سے زیادہ یعنی عشق کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ اور سب کچھ چھوڑ بیٹھے۔ اور یہی حال خدا اور اس کے رسول سے محبت کرنے کی مختلف نوعیتوں کا ہے۔ عقل، علم اور محبت کی ایک اور مثال لیجئے: حکم ہوا، جھکو۔ سب جھک گئے۔ ایک نے اپنے عقل وعلم کو استعمال کیا، نہیں جھکا۔ ماسٹر نے کہا کہ اگر نہیں جھکے گا تو کنویں میں گرے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ اس کنویں میں رہے گا۔ بڑے طنطنہ سے اس نے جواب دیا۔ مجھے یہ منظور ہے لیکن جھکوں گا نہیں۔ یہ عقل وعلم کا فیصلہ نہیں ہے، یہ احمقانہ کبر کا فیصلہ ہے سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے بھی آگ کو پسند کر رہا ہے بالکل اسی طرح جیسے بڑھی ہوئی محبت میں بغیر سوچے سمجھے اقبالؔ کبھی عشق کو آگ میں کود وا دیتے ہیں، اور کبھی کربلا کی دھرتی پر بھوکا پیاسا چھوڑ دیتے ہیں۔ یقین جانئے! حسینؓ وابراہیم کی اس سے بڑی توہین کیا ہو سکتی ہے کہ ان محبتوں میں انکی عقلیں ماؤف تھیں؟

یہی وجہ ہے کہ جب یہ حکم ہوتا ہے کہ دیکھو، اس درخت کے پاس ہرگز نہ جانا ورنہ تم بھی اس احمق کی طرح نافرمانوں میں شمار ہوگے، تو کمال احتیاط کے بعد بھی وہ اس درخت کے پاس پہونچ جاتے ہیں، شاید اس درخت سے بڑھی ہوئی پسندیدگی گرویدگی یا کسی اور چیز کے سبب تو کیا ہوتا ہے؟ لگتے ہیں اپنی نفس کو لعنت وملامت

کرنے اپنی عقل کے پتھرا جانے پر ایسا افسوس کہ ندامت و لجاجت کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ معافی، معذرت توبہ کا ایسا تانتا باندھتے ہیں کہ بالآخر انہیں تسلی و تشفی کا مژدۂ جانفزا سنایا جاتا ہے۔ اگر وہ بھی اس کی طرح اپنی "احمقانہ کبر" کو استعمال میں لاکر اپنی عقل کو بالائے طاق کر دیتے تو ــــ ؟ سوچیے کیا ہوتا!

دراصل عشق کی ہی طرح، "کبر" بھی ایک بڑھا ہوا جذبہ ہے کہ جس پر اگر عقل و علم کی لگام نہیں تو اس کا مقدر بھی کنواں ہے۔ یہ کنواں آگ کا بھی ہو سکتا ہے اور برف کا بھی، یہ تو علیم و خبیر اور کبریا کا کام ہے کہ وہ کنواں کی تخلیق کس طرح کرتا ہے۔

تو اب معاملہ صاف ہو گیا کہ ایک وہ محبت ہوتی ہے جس کی بنا عقل ہے۔ جو اپنی عقل و صورت خواہ کسی حد سے بڑھ جائے، محبت ہی رہتی ہے۔ مثلاً، دین الٰہی کی محبت میں امام حسینؑ کی شہادت۔ اور دوسری محبت وہ ہے جس کا سرچشمہ طبعی جذبات ہوتے ہیں۔ جو اگر حد سے بڑھ جائے تو عشق سے عبارت ہے۔ مثلاً قیس و فرہاد کی داستان دل یا میرؔ و اقبالؔ کی شعریات۔

ہو سکتا ہے کہ آپ اقبالؔ کی شعریات کو اب آپ عشق کا مکمل اور بھرپور تجربہ کہنا پسند نہ کریں؛ اور ان کے عاشقانہ تجربوں میں عقل و خرد کی کارگذاریوں کا منظر بھی آپ دکھلانا چاہیں، تو عرض ہے کہ اقبالؔ کے عشق کے تجربوں میں بڑھی ہوئی محبت کی بہتات کے سبب، عقل و خرد کے مناظر دب سے گئے ہیں؛ شعریات ابھر گئی ہے: نظریہ مرا مرا، بجھا بجھا سا ہے۔ مگر ہے ایک نظریہ؛ اور وہ نظریہ ہے اسلام کا۔ اور یہ اسلام کا ہی فیضان ہے کہ جیسا میں نے بارہا لکھا کہ اقبالؔ آج بھی زندہ ہیں؛ اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔